ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول

ڈاکٹر ایشور ٹوپا

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

(جملہ حقوق محفوظ)

136084

تعداد ایک ہزار
اشاعت ۱۹۶۲ء
قیمت ۲ روپیہ ۲۵ نئے پیسے

REVISED PRICE
R [illegible]
A [illegible] N DELHI.

مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ

Marfat.com

فہرست

		صفحات
پیش لفظ	پروفیسر محمد مجیب	۵

پہلا حصّہ

ابتدائی ہندی مسلم تمدّنی تعلقات

پہلا باب۔	عہدِ وسطیٰ میں ہندی مسلم تمدنی و سیاسی اثرات	۹

دوسرا حصّہ

ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول

دوسرا باب۔	عربی راج نیتی	۳۰
تیسرا باب۔	غزنوی راج نیتی	۳۵
چوتھا باب۔	غوری راج نیتی	۴۱
پانچواں باب۔	بلبن شاہی	۴۵
چھٹا باب۔	کیقباد شاہی	۴۹

Marfat.com

ساتواں باب۔ خلجی شاہی ۵۳
آٹھواں باب۔ تغلق شاہی ۶۱
نواں باب۔ فیروز شاہی ۷۳
دسواں باب۔ ہندوستانی مسلمانی راج کا سرسری جائزہ ۹۰
گیارھواں باب۔ مغل دور کے چند ممتاز بادشاہوں کی تمدنی خصوصیات ۱۱۲

Marfat.com

پیش لفظ

اس کتاب کا مقصد ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ اس دور کا ایک سرسری جائزہ لینا ہے بالخصوص وہ مسائل پیش نظر رکھے گئے ہیں (مثلاً جزیہ کا مسئلہ) جن کے متعلق لوگوں میں (خاص طور پہ ہماری درسی تاریخی کتابوں کے مصنفوں میں) بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔

حالاں کہ یہ کتاب صرف ۱۵۶ صفحات پہ مشتمل ہے لیکن مصنف کے وسیع تاریخی مطالعے اور علمیت کا پتہ دیتی ہے۔ فارسی ماخذ بہت احتیاط سے استعمال کیے گئے ہیں۔ مصنف نے بجا طور پہ پڑھنے والوں سے قرون وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ سے کچھ واقفیت کی امید رکھی ہے۔ جس کے بغیر اتنا مختصر لکھنا مشکل تھا۔ اگر کسی نے

اسکول میں ہندوستان کی تاریخ پڑھی ہے تو اسے اس کتاب کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوگی۔

ڈاکٹر ٹوپا کی اس تحقیق کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ یہ ان موجودہ (تاریخی) غلط فہمیوں کا ازالہ کرتی ہے جو برٹش حکومت کے زمانے میں پیدا ہو گئی تھیں۔ اس نقطۂ نظر سے یہ کتاب بہت اہم ہے اور اس سے اچھی کتاب اب تک میری نظر سے نہیں گزری ہے۔

ڈاکٹر ٹوپا ہندو اور مسلم مذاہب کے بارے میں گہری معلومات رکھتے ہیں اور اس سے انھوں نے بہت استفادہ کیا ہے۔ اگر مجھے اس کی اجازت ہو کہ ڈاکٹر ٹوپا نے جس بنیادی بات کو اس کتاب میں پیش کیا ہے اسے ایک جملے میں کہہ سکوں تو وہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی پالیسی سیاسی مصلحتوں سے اثر انداز ہوتی رہی ہے نہ کہ مذہبی اور تبلیغی جذبات سے۔

ضیاء الدین برنی کی کتاب "فتاویٰ جہاں داری" (۱۳۵۷ء) میں جس کا مسودہ حال ہی میں دریافت ہوا ہے اس بات پر اور بھی زیادہ زور دیا گیا ہے۔ برنی لکھتا ہے: "جہاں داری کے ضوابط رسول اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں کے درمیان ابدی تضاد اور تصادم ہے اور ان دونوں میں کبھی یگانگت نہیں ہو سکتی۔"

Marfat.com

اس کتاب کا طرز تحریر سادہ اور مؤثر ہے اور پڑھنے والوں کو قائل کر دیتا ہے۔ اس کی اشاعت سے اردو ادب اور تاریخ ہند دونوں کی ایک عظیم خدمت ہو گی۔

(پروفیسر) محمد حبیب
۵ مئی سنہ ۱۹۵۹ء

Marfat.com

Marfat.com

پہلا باب

عہدِ وسطیٰ میں ہندی مسلم تمدنی و سیاسی اثرات

عام طور سے اس خیال کو اہمیت حاصل ہے کہ شمال مغربی ہندوستان سے مسلمانوں کا تعلق سب سے پہلے جڑتا ہے کیونکہ اسی علاقہ سے وہ ہندوستان وارد ہوئے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ تمدنی تجارتی اور علمی میل جول کا سلسلہ جو ہندوستان سے قائم ہوا اس کی ابتداء تقریباً نویں صدی عیسوی کے آخر سے ہوئی اور کئی سو سال تک جاری رہی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں مسلمانوں کی کوئی حکومت قایم نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانی حکومت کے قیام کے بہت زمانہ پہلے ہندوستان اور مسلمانی ملکوں میں دوستی اور اتحاد کے تعلقات جڑ چکے تھے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔ اس ہندی مسلمانی سلسلہ کی ابتداء دراصل جنوبی ہندوستان سے ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی تاریخ کا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ عربوں کی تجارت چین

تک پھیلی ہوئی تھی اور تجارتی کاروبار کے سلسلہ میں ہندوستان کے مختلف علاقوں پہ انھوں نے منڈیاں قایم کرلی تھیں اور بعض مرتبہ ساحلوں پہ اُترتے بھی تھے جس کی وجہ سے ملابار اور لنکا کے مقاموں نے تاریخی حیثیت حاصل کرلی۔

ملابار کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عرب سوداگروں کے تجارتی بیڑے لنکا کے راستے سے ہوتے ہوئے چین آیا جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک ایسے ہی بیڑے میں ایک عجمی درویش بھی تھے جو لنکا کی زیارت کے لئے چلے تھے، مگر سمندر میں طوفان آنے کی وجہ سے ان کو ملابار کے ساحل پہ مجبوراً اترنا پڑا۔ ان مسافروں کی بپتا سُن کر ملابار کے راجا زمورین (ملاباری زبان میں جسے سامری کہتے تھے) نے ان کی آؤ بھگت کی اور ان سے دریافت کیا کہ وہ کہاں کے لوگ ہیں اور ان کا مذہب کیا ہے۔ رخصت کرتے وقت راجا نے ان سے خواہش کی کہ وہ واپسی پر اس کی راجدھانی میں دوبارہ آئیں۔ ان عربوں اور درویشوں نے اپنا وعدہ پورا کیا اور ملابار آئے راجا سامری سے ان کی ملاقات ہوئی اور اس نے ان کے مذہب کے متعلق اچھی خاصی معلومات حاصل کیں۔

ملاباری روایت یہ ہے کہ راجا ان کے مذہب کے اصولوں سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اس بات کا تصفیہ کیا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ ہولے تاکہ اپنی آنکھوں سے خود دیکھ سکے کہ مسلمان جس مذہب کے

Marfat.com

پیرو ہیں اس کا حال وہاں لکھا ہے۔ اپنے راج پاٹ کے کاموں کو اس نے اپنے پنتروں کے حوالے کر کے ان کے ساتھ ہو لیا۔

اسلام کی تاریخ کا یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت عمرؓ مسلمانوں کی زندگی کی پرداخت میں نمایاں حصّہ لے رہے تھے یعنی اس بات کی جد و جہد کر رہے تھے کہ اسلام کا قانون (قرآن) ان کی زندگی کے لیے ہدایت اور عمل بن سکے۔ راجہ سامری اس خلیفہ کی علمی زندگی سے بے حد متاثر ہوا۔ ملابار کی روایت یہ بھی بتاتی ہے کہ جس وقت راجہ اپنے ملک کو لوٹ رہا تھا تو راستہ میں وہ بیمار ہوا اور بیماری کی حالت میں اس نے ایک فرمان اپنے وزیروں کی ہدایت کے لیے روانہ کیا تاکہ اس کے لوگ اور اس کی حکومت اس شاہی فرمان کی تعمیل کرے۔ اس کی بیماری اتنی بڑھ گئی کہ راستہ میں اس کا انتقال ہو گیا اور وہ اپنی راجدھانی کو واپس نہ ہو سکا۔ حکومت نے اس کے فرمان کی تعمیل کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملابار کی تہذیب اور تمدن میں ایک گہرا انقلاب ہو گیا۔ مسلمان تاجروں اور بزرگوں کو بسنے کی اجازت کے ساتھ ساتھ جو ہمت افزائی کے جذبات سامری کے شاہی فرمان سے ظاہر ہوتے ہیں اس سے ملک میں ترقی کی راہیں کھل بڑیں اور ملابار کی سرزمین پر مسلمانوں کی نئی بستیاں آباد ہو گئیں جس سے ملک میں نئی جان پڑ گئی۔ ملابار کے نو وارد مسلمانوں کو قانون اسلام پر عمل کرنے کی پوری آزادی دی گئی۔ اس نو آبادی کی وجہ سے ملک کی معاشی

حالت میں بھی نمایاں اضافہ ہونے لگا، خوشحالی بھی نظر آنے لگی تعلقات نے ایک نئے تہذیبی مرکز کی بنا ڈالی اور مقامی لوگوں پہ مسلمانی زندگی کا اثر پڑنے لگا۔

ملابار نے جو نئے تعلقات مسلمانوں سے پیدا کئے آگے چل کر اس سے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے تہذیبی باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ اس ملواں تہذیب کی جو ملاباری اور عربی تہذیبی قوتوں سے بنی تھی اس کی نشوونما مسلمانوں سے شادی بیاہ سے ہوئی۔ ملاباری گھروں میں مسلمانی اثرات مختلف طریقے سے ظاہر ہونے لگے اور ملاباری گھر ایک ملواں کلچر کا نمونہ بن گئے جو آج تک ملابار کی سرزمین پہ اپنا اثر دکھا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ملابار کی زبان بھی اس کلچری اثر کی ایک زندہ مثال ہے۔ اس تہذیبی میل جول نے سماجی کاموں میں صرف نیا پن ہی پیدا نہیں کیا بلکہ ملک کی اصلی شکل بھی بدل دی۔ یہی وجہ تھی کہ صدیوں تک ملابار ترقی اور دوستی کی قوتوں کا گہوارہ بنا رہا اور ملابار کی زندگی پُرامن اصولوں پہ کاربند رہی۔ ہندوستانی زندگی کی یہی وہ داغ بیل تھی جس میں مسلمانوں اور ملابادیوں کا آپس کا میل جول امن پسندانہ رہا۔

لنکا کو بھی ہندوستان کی تہذیبی تاریخ میں امتیاز حاصل ہے جو مذہبی لوگوں کے لیے ہمیشہ ایک مرکز بنا رہا جہاں جاترا یا زیارت کی خاطر سے لوگ آیا جایا کرتے تھے۔ اس وجہ سے مختلف مذہبوں کے

Marfat.com

لوگ آباد ہوتے گئے۔ شیومت کے پیرو اور بدھ مت کے ماننے والے لنکا کے باشندے تھے مگر جب مسلمانوں نے چین سے تجارت کا سلسلہ جاری کیا تو اس وقت سے اس دیس میں مسلمان بزرگوں نے آنا جانا شروع کیا۔ اس طرح لنکا مسلمانوں کی عقیدت کا ایک اہم مرکز بن گیا مسلمانوں کی روایت یہ بتاتی ہے کہ لنکا وہ جگہ ہے جہاں حضرت آدم کا نقش قدم موجود ہے۔ اس کو انگریزی زبان میں "ADAM'S PEAK" بھی کہتے ہیں۔ یہ ایک پہاڑی ہے جس کے متعلق بدھ لوگوں کا یقین ہے کہ یہ نقش قدم گوتم بدھ کا ہے اور شیومتی اس کو شیو کا قدم سمجھتا ہے مسلمان، شیو اور بدھ کے ماننے والے اس پہاڑی کی جاترا کرتے تھے اس طرح سے تین تہذیبوں کا سنگم اس پہاڑی پہ ایسا ہوا کہ مسلمان، شیومتی اور بدھ متی آپس میں میل کھانے لگے۔ اس مقام پہ لنکا کی نئی ملواں تہذیب جنم لیتی ہے اور اس کی تہذیبی زندگی کی خصوصیت میں بڑی نمایاں تبدیلی ہوتی ہے۔ دُنیا کی تاریخ میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ جب مختلف ملکوں کے لوگ کسی ایک ملک میں بستے ہیں تو اس ملک پہ ایک نیا تہذیبی رنگ چڑھتا ہے اور اس ملک کی عام زندگی بھی کافی متاثر ہوتی ہے۔ اس طرح لنکا کی زندگی میں تبدیلی حضرت آدم کے نقش قدم نے بھی پیدا کی۔ جس طرح ملابار میں ایک ملواں تہذیب ظہور پذیر ہوئی اسی طرح لنکا کی پرانی تہذیب میں نئے اتحادی اور انسانی اثرات بھی رونما ہوئے اور

Marfat.com

ایک ملواں تہذیب کا مرکز بنا اور جس نے صدیوں تک اپنی تہذیبی خصوصیت کو بحال رکھا۔

ہندوستان کے دونوں ساحلوں پر زمانہ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی نو آبادیاں قایم ہوتی رہیں۔ ان آبادیوں کے قیام میں دراصل تہذیبی میل ملاپ کے عناصر اتنے کارگر نہ تھے جتنے کہ مالابار اور لنکا میں۔ لیکن ہندوستان کے ساحلی علاقے مسلمانوں کے تہذیبی اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے علاوہ مسلمانوں کے تعلقات ہندوستان کے اندرونی علاقوں سے بھی وقتاً فوقتاً ہوتے رہے اور ایسے تعلقات کی بنیاد مسلمانی راج کے قیام سے بہت پہلے پڑ چکی تھی۔ ادھر شمال میں ملتان سے لے کر کشمیر تک کے علاقے اور ادھر کچ سے لے کر گجرات تک مسلمان پھیلتے جا رہے تھے اور ان کی آؤ بھگت ان علاقوں میں کی جا رہی تھی۔ اکثر ہندی حکومتوں نے مسلمانوں کو آباد ہونے کی بھی دعوت دی تھی۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے ملک میں تجارتی اور صنعتی ترقی ہوئی تھی۔ شہر بسانے کے سلسلہ میں مسلمانوں کو عام مراعات دی گئیں کہ وہ مسجدیں بنا سکتے ہیں اور مذہبی رسومات کو آزادی کے ساتھ ادا کر سکتے ہیں اور اسلامی قانون پر زندگی بسر کرنے کی عام اجازت بھی دی گئی۔ عربوں کی روایت یہ ہے کہ گجرات کا ایک راجا بلہارا نامی گجرات کے عربوں کا بہت ہی ہر دلعزیز راجا گزرا ہے جس نے مسلمانوں کو اپنے ملک میں آباد ہونے دیا اور اپنے دورِ حکومت میں

جس طرح وہ اپنی رعایا کے ساتھ انصاف سے پیش آتا تھا اسی طرح وہ مسلمانوں کو اپنی رعایا سمجھ کر ان کے ساتھ انصاف برتتا تھا۔ اس کے زمانے میں عام مذہبی بحث مباحثے ہوا کرتے تھے تاکہ لوگ ایک دوسرے کے مذہب کو سمجھیں اور اس طرح ایک مذہب والے دوسرے مذہب والوں سے رواداری، ہمدردی اور محبت کر سکیں اور اپنے آپ کو انسانی رشتہ میں جوڑ سکیں۔ ملتان اور کشمیر کے بیچ کے علاقوں کے متعلق جو دلچسپ شہادتیں ملتی ہیں اُن سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ وہاں کے رہنے والوں نے بھی مسلمانی طرز زندگی کے اصول سے اثر لیا تھا۔ ایک اور روایت یہ ہے کہ ہندوستان میں پہلی مرتبہ قرآن کا ترجمہ ان ہی علاقوں کی ایک ملکی زبان میں ایک راجہ کی سرپرستی میں کرایا گیا تھا۔ مسلمانوں کی ادبی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے بعض راجاؤں نے جن کے ناموں کا پتا نہیں چلتا اس بات کی کوشش کی تھی کہ وہ اسلام کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کریں۔ ان میں سے ایسے راجا بھی تھے جنھوں نے اپنے سفیروں کو مسلمانوں کے ملکوں میں بھیجا اور دریافت کیا کہ اسلام کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ روایت یہ بھی بتلاتی ہے کہ ایک راجا نے خلیفۂ وقت کو دعوت نامے بھی بھیجے اور لکھا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس اگر کوئی عالم ایسا ہو جو اسلام کے صحیح اصولوں کی وضاحت کر سکے روانہ فرمائیں۔ اسی طرح دوسری روایت یہ بھی ہے کہ

Marfat.com

ایک دوسرے راجانے اپنے خط میں اس خیال کو ظاہر کیا کہ آیا اسلام محض تلوار کے اصول کا نام ہے یا وہ کسی اور اساسی اصول پہ قائم ہے۔

ہندو اسیوں اور مسلمانوں کے مابین جو تعلقات قائم ہوئے ان کی ابتدا ہندوستان میں مسلمانی حکومت کے آغاز سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اس طرح اسلام کی اصولی زندگی کا اثر ہندواسیوں کے دلوں میں دلچسپی ہی پیدا نہیں کر رہا تھا بلکہ ان میں ایک شوق اور خواہش بھی اُجاگر ہو رہی تھی تاکہ وہ واقف ہوں کہ مذہب اسلام کیا ہے اور انسانی ترقی کی راہ میں اس کا نصب العین کہاں تک پورا اترتا ہے۔ ان ابتدائی تعلقات کے دوران میں جس طرح ہندواسیوں نے اسلام کے پیروؤں کی آؤ بھگت کی اور ان کو مراعات دینے میں اعلیٰ انسانی جذبہ سے کام لیا اسی طرح نووارد مسلمان بھی اس قدیم اور مہذب ملک کے حالات سے واقفیت پیدا کرنے میں ہمہ تن مصروف رہے اور ہندوستانی مذہب و ملت کو سمجھنے میں شوق اور دلچسپی کا اظہار کرتے رہے تاکہ اپنی تہذیب کو ہندی تہذیب سے مالا مال کریں۔

خلیفہ منصور کے زمانے میں جب مسلمانوں کی زندگی کا مرکز بغداد سے ہٹ کر عراق بنا اور مسلمانی تہذیبی زندگی یونانی اثرات سے متاثر ہونے کے بعد اس خیال نے فوقیت حاصل کی کہ ہندوستان بھی

Marfat.com

مسلمانی زندگی کی تشکیل میں نمایاں حصّہ لے سکتا ہے تو مسلمانوں نے ہندوستان کی طرف توجہ کی جس کی ابتداء دراصل حضرت عثمان کے زمانہ سے ہوئی اور نتیجہ کے طور پہ ایک تحقیقاتی وفد ہندوستان بھیجا گیا تاکہ اس ملک کے متعلق معلومات فراہم کی جائیں۔ حضرت عثمان کا خیال ہندوستان فتح کرنا تھا لیکن یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔ اس خیال نے دوسرے خلیفوں کے عہد میں بھی زور پکڑا کہ ہندوستان کی فتح اگر ممکن ہے تو اس کے لیے کیا تدبیریں کرنی چاہئیں۔ عربوں کی جانب سے جو کوششیں ہندوستان کی فتح کے سلسلہ میں ہوئیں وہ تقریباً دو سو سال تک رہیں، لیکن وہ پورے ہندوستان کو فتح کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ صرف سندھ پر ان کا تسلط قایم ہو سکا اور ہندوستان کے سرحدی حصّہ پر اپنا قبضہ تھوڑے عرصہ کے لیے کر سکے تھے۔ ہندوستان کی سرحد اس وقت تک سیستان تک پھیلی ہوئی تھی اور وسط ایشیا کے ملکوں پر بھی ہندوستانی تہذیب کا غلبہ تھا۔ عربوں کی تمام کوششیں شمالی راستہ سے ہندوستان میں داخل ہونے میں ناکام رہیں۔ وہ صرف سندھ کی حد تک کامیاب ہوئے جہاں انھوں نے دو سو سال تک اسلامی اصولوں پہ حکومت کی۔ عربوں کی سندھ کی فتح ہندوستان کی فتح سے جو دوسرے مسلمانوں نے کی مختلف تھی۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہی ایک علاقہ ہے جہاں اسلامی قانون کے تحت حکومت کی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عرب اسلامی روایت اور دستور کے حامل تھے اور ہندوستان

کے ترکی سلطان نومسلم ہونے کی حیثیت سے اسلامی تاریخ، روایت اور دستور سے بہت دور تھے۔ ان کی زندگی پہ جو اثر رونما ہوا تھا وہ ایرانی تھا اور ایرانی تخیل، طریقے اور حکومت ان کا شعار تھا۔ عربی اور ترکی حکومتوں میں جو فرق ہندوستان کی سیاسی دنیا میں نظر آیا اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے۔ لہٰذا سندھ میں اسلامی حکومت کا آغاز ہوتا ہے اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں جب مسلمانوں نے حکومت کی تو وہ اسلامی نہ تھی بلکہ ایرانی۔ جہاں جہاں مسلمان حکمرانوں نے اپنی اپنی حکومت کی داغ بیل ڈالی وہاں ایک بھی ایسی تاریخی شہادت نہیں ملتی جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ اپنی حکومت کا اصول ٹھیٹ اسلامی اصول بنانا چاہتے تھے۔ ان کی حکومت سیاسی رہی اور وہ سیاسی اصولوں کے مدنظر حکومت کرتے رہے گو تمام کے تمام حکمران مسلمان تھے۔ انھوں نے اسلامی شعار کی بجائے سیاسیات بادراج نیتی کو اپنا مسلک قرار دیا جس کی تفصیل اگلے باب میں ہوگی۔

خلیفہ منصور کی سرپرستی میں ایک وفد ہندوستان آیا۔ وہ کوئی تجارتی وفد نہ تھا اور نہ کوئی سیاسی۔ بلکہ تہذیبی تعلقات کے پیدا کرنے کی غرض سے بھیجا گیا تھا۔ اس وفد کی وجہ سے ہندوستان اور اسلامی ملکوں سے ایک نیا تہذیبی رشتہ یوں جڑا کہ ہندوستان کی تہذیب کا چرچا اور اس کا پرچار مسلمانوں کے ہاتھوں دنیا میں ہونے لگا مسلمانوں نے ہندوستان سے سیکھا اور سیکھنے کے بعد اس احسان کو ہندی علم اور

Marfat.com

ہنر کو مکمل کر کے اسے دُنیا میں عام کیا۔

ہندواسیوں اور مسلمانوں کی زندگی کا یہ وہ وقت تھا جب ایک ملک علم اور ہنر کے میدان میں اُتر کر دوسرے ملک کے احسان کا بدلہ دیتا ہے تاکہ دنیا انسانی علم سے مستفید ہو سکے۔ اس طرح ہندوستان سے بدھ متی عالموں کا ایک جتھا عراق پہنچتا ہے۔ یہ بدھ متی عالم اپنے ساتھ ہندوستان سے ہر قسم کا بیش بہا لٹریچر لے جاتا ہے خلیفہ نے ان کی آؤ بھگت اس پیمانہ پر کی جیسا کہ سفیروں کی بدیسی ملکوں میں ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ یہ ہندوستان کے عالم سفیر تھے جو اس غرض سے عراق بلائے گئے تھے کہ مسلمانی زندگی کو ہندوستان کی معلومات سے مالا مال کر سکیں۔ خلیفہ نے ان عالموں کی نگرانی کے تحت ایک دالترجمہ قایم کیا تاکہ ہندوستان کا علم عربی زبان میں منتقل کیا جا سکے اس علمی تحریک کے باعث رفتہ رفتہ ایک جماعت مسلمان عالموں کی پیدا ہوئی جو ہندوستانی بدھ متی استادوں کے شاگرد تھے اور ان میں سے بعض شاگردوں نے ایسی ترقی اور مہارت حاصل کی کہ اپنے استادوں سے بھی بڑھ گئے اور علمی دنیا میں اپنا سکّہ جمایا یہی مسلمان شاگرد تھے جنھوں نے بے پوش اور ناقابل فراموش خدمات ہندوستان کے علم کی اشاعت میں کیں۔ اس نامور جماعت کا آخری بے مثل عالم البیرونی تھا۔

ہندوستان سے جو علم بدھ متی عالموں کے ساتھ عراق پہنچا

تھا وہ مختلف علوم پر مشتمل تھا۔ کتابیں جو زیادہ تر ہندوستان سے گئیں وہ طبّی تھیں۔ طبّی کتابوں کے ترجمے عربی میں کئے گئے۔ ان میں سے ششرت کی مشہور کتاب جس میں بیماریوں کی علامتیں اور ان کا علاج اور دواؤں کی تفصیل ہے، منکہ پنڈت نے ترجمہ کی۔ برامکہ کے شفاخانہ میں اس کتاب کی حیثیت ایک طبی دستورالعمل کی تھی۔ یحییٰ بن خالد کے حکم سے اس کا ترجمہ کیا گیا تھا۔

چرک (ہندوستان کا بہت بڑا اور مشہور طبیب) کی کتاب کا ترجمہ پہلے فارسی میں ہوا اور عبداللہ بن علی نے اس کو فارسی سے عربی میں منتقل کیا۔ سدھانت کا ترجمہ ابن دھن کے ذمہ کیا گیا جو شفاخانہ بغداد کا اعلیٰ افسر تھا۔

دوسری کتاب ندان جس میں چارسو بیماریوں کی صرف پہچان کا ذکر ہے (علاج کا نہیں) ترجمہ کی گئی۔

ایک کتاب جڑی بوٹیوں کی مختلف صفتوں سے متعلق بھی منکہ پنڈت کے ہاتھوں ترجمہ ہوئی۔ اور ایک کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا جس میں دوائیوں کے سرد اور گرم، ان کی قوتوں اور موسموں کی تقسیم کے متعلق ہدایات درج ہیں۔ اسی طرح ایک دوسری کتاب طب پر جس میں بیماریوں کے وہم اور اسباب کا ذکر تھا ترجمہ ہوئی۔ ایک اور کتاب حاملہ عورتوں کے علاج کے متعلق بھی عربی زبان میں منتقل ہوئی۔ ان طبی کتابوں کے ساتھ ساتھ وہ کتابیں بھی ہندوستان

Marfat.com

سے گئی تھیں جن میں جانوروں کے علاج درج تھے۔
ان طبّی کتابوں کے علاوہ یہاں سے خالص لٹریچر نجوم، جوتش، رمل، جفر، ہشت ریکھا کا علم (پامسٹری)، سانپوں کا علم (سرپ وِدّیا کی کتاب راسے نامی پنڈت کی ہے)، موسیقی، فوجی لٹریچر، کہانیاں اور افسانوں کی کتابیں بھی یہاں سے عرب پہنچیں اور ان کے ترجمے خلیفہ منصور نے کرائے جنھیں ان علوم سے بے حد دلچسپی تھی۔ ہندوستان کی موسیقی کے متعلق اسپین کا ایک مورخ قاضی صاعد اندلس جو ۱۰۷۰ء کا آدمی ہے لکھتا ہے کہ "موسیقی میں ہندوستان کی یہ کتاب نافر ہم تک پہنچی ہے جس کے لغوی معنی دانائی کے پھل کے ہیں۔ جس میں راگوں اور سروں کا بیان ہے۔" قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ فارسی کا نوبر (نیا پھل) نام ہو اور فارسی ترجمے سے عربی میں منتقل کی گئی ہو۔ مہابھارت کے کچھ قصے پہلے فارسی میں منتقل کیے گئے تھے جس کو ابو صالح بن شعیب نے عربی میں ترجمہ کیا۔ سیاست، جنگ اور راج نیتی کی کتابیں جو چانک اور ودیا گھر نے تصنیف کی تھیں عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ چانک کی کتاب کا مضمون لڑائی کا انتظام، بادشاہ کو کیسے آدمیوں کا چناؤ کرنا چاہیے، سواروں کی تربیت، کھانا اور زہر پر مشتمل تھی۔ ودیا گھر کی کتاب "تلواروں کی پہچان ان کی خوبیوں اور نشانات سے تعلق رکھتی تھی۔ سنسکرت سے ایک اور کتاب کا ترجمہ عربی میں ہوا۔ اس کا نام "ادب الملک" تھا۔

Marfat.com

یعنی سلطنت کے طریقے بیان کئے گئے تھے۔ اس کا مترجم ابوصالح بن شعیب تھا۔ یہاں تک کہ کیمیا پر بھی ایک کتاب عربی میں منتقل ہوئی۔ اسی طرح علم منطق، کرتب، جادو اور منتر کی کتابیں بھی عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ ہندوستان کی کئی کتابیں جو کہانیوں اور افسانوں کی تھیں ترجمہ ہوئیں جن میں سے سندھ باد حکیم (پنڈت) کی مشہور کتاب تھی۔ ہندوستان کی دوسری مشہور سنسکرت کی کتاب سدھانت جو آریا بھٹ کی تصنیف تھی عربی میں ترجمہ ہوئی۔ کھنڈا کھنڈیک بھی عربی میں ترجمہ کی گئی۔

حساب کا علم جو ہندوستان کی ایجاد ہے وہ بھی عربوں کے ہاتھوں میں آیا اور ان کے ذریعہ سے یورپ کو پہنچ سکا۔ عرب میں جو حساب کا طریقہ رائج تھا وہ دراصل عدد کا تھا لیکن ہندوستان نے اسے حسابی رقموں میں ۹ تک لکھنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ صحیح تاریخ کا تعین مشکل ہے کہ عربوں نے ہندوستان کا یہ طریقہ کب سیکھا مگر خیال کیا جاتا ہے کہ سنہ ۱۰۵۶ء میں جب سندھ سے پنڈت گئے تو اُن ہی کے ساتھ یہ علم بھی گیا ہوگا۔ جس وقت سدھانت کا ترجمہ ہوا تو اس کتاب میں حساب اور رقم کے باب بھی ترجمہ ہوئے ہوں گے۔ عربی میں پہلے لفظوں میں عدد لکھے جاتے تھے۔ یہودیوں اور یونانیوں کی طرح بعد میں انھوں نے حروف ابجد اختیار کئے محمد بن موسیٰ خوارزمی کی کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ ہندی حساب عربی

136084

Marfat.com

قالب میں ڈھالا گیا۔ اس کے بعد نویں صدی عیسوی کے شروع میں علی بن احمد نصوی نے درا صل مسلمانوں میں اس حساب کو پھیلانے کی انتھک کوشش کی اور ایک کتاب لکھی جس کا نام المقنع فی الحساب الہندی (یعنی ہندی حساب میں خواہش پوری کر دینے والی) ہے۔ اس کو عام طور پہ سکھایا جانے لگا۔ نجوم اور ہیئت پہ بھی بدھستی وفد اپنے ساتھ کتابیں لے گیا۔ مسلمانوں کی ادبی شہادت اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ ہندوستان کے لوگ عقلمند اور غور و فکر کرنے والے لوگ ہیں اور یہ سب قوموں سے بڑھ کر قوم ہے۔ جوتش اور نجوم میں ان کی معلومات سب سے زیادہ درست ہیں۔ سدھانت ان ہی کی ذہانت کی پیداوار ہے جس سے یونانی اور ایرانی دونوں فائدہ اٹھا سکیں۔ علم طب میں ہندوستانیوں کا فیصلہ سب سے آگے ہے منطق اور فلسفہ پہ کتابیں ہندوستان میں لکھی گئیں۔ تیسری صدی کے آخر میں ابوزید صرانی ہندوستان کے لوگوں کی اچھی خاصی تعریف کرتا ہے۔ جو بدھستی پنڈت یہاں سے لے گئے تھے اور جن کی بڑی عزت مسلمانوں نے کی تھی۔ ان کی تفصیل یہ ہے:۔

بھیلا، منکہ، بازیگر، فلبوفل، سندباد۔

احیاء بن خالد اور برامکی کے زمانے میں جو طبیب گئے اور جنھوں نے عربی میں طب اور نجوم پہ کتابیں ترجمہ کیں اُن کے نام یہ ہیں:۔

باکھر، اجا، سنک، داہر، انکو، زشکل، ار بسکل، جہر، عندی اور جیاری۔

ان ہندی عالموں اور طبیبوں نے اپنے مسلمان شاگردوں میں بڑی دلچسپی لی اور ان علم سکھانے میں کسی طرح کا بھی گریز اور تامل نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ان شاگردوں میں دو عرب شاگرد بے حد مشہور ہوئے۔ ابراہیم نزاری اور یعقوب بن طارق۔ ان ہی شاگردوں کا تحقیقی شوق تھا جس کی وجہ سے انھوں نے اپنے استادوں کی غلطیاں درست کیں اور ان کی تصنیفوں میں اصلاحیں بھی کیں یہ تحقیقی علمی سلسلہ بغداد سے لے کر اسپین تک تیزی کے ساتھ بڑھتا گیا۔ اس طرح ہندی ودّیا اصلاحی روپ اور نئے رنگ میں مغربی دنیا کو متاثر کرنے لگی۔ مسلمانوں میں، جو ایک نئی سائنٹفک اسپرٹ ہندی بدھمتی عالموں کی وجہ سے پھیلی اس کا سلسلہ گیارھویں صدی عیسوی تک بلا روک ٹوک جاری رہا۔ اس علمی، ادبی اور سائنسی تحقیق کے کام میں جن عربوں نے نمایاں حصہ لیا ان کے نام یہ ہیں :-

حسن بن صبّاح، احسن بن حبیب، فضل بن حاتم، تبریزی، احمد بن عبداللہ، مرضی ابن اللہ دمی، عبداللہ اور ابو ریحان بیرونی۔

ابوریحان بیرونی یہ گیارھویں صدی کا عالم تھا جو سلطان

Marfat.com

محمود غزنوی کا ہم عصر تھا۔ یہ فلسفی، نجومی، ادیب اور ریاضی داں گزرا ہے۔ اس کی دھاک اپنے زمانے پر بیٹھی ہوئی تھی وہ دراصل اس عربی ہندی تحقیقی سلسلہ کی آخری کڑی تھا۔ جو ہندوستان اور مسلمانوں کے درمیان سو سال تک قائم رہی۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایک تہذیبی سفیر تھا تو غلط نہ ہوگا جس نے علمی تحقیق سے اس مسلک کو حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ ایک ملک والے دوسرے ملک کے لوگوں کو صحیح معنوں میں سمجھ سکیں اور دوستی کے رشتے کو مضبوط کر سکیں۔ البیرونی بحیثیت عالم کے مسلمانوں کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ ہندوستان ایک مہذب ملک ہے اور علم و ہنر میں ایک اونچی منزل تک پہنچ چکا ہے۔ اس سے ناواقف اور علیحدہ رہ کر دوسرے ملکوں کے لئے باعث فخر نہیں ہو سکتا اور دوسری طرف اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ ہندوستان مسلمانوں کی تہذیب اور ان کے علوم سے واقفیت پیدا کرے۔ ان ہی اصولوں پر اس نے اپنی علمی تحقیق اور کھوج کی بنیاد رکھی۔ اس نے سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں اور عربی کی کتابوں کا سنسکرت میں کیا۔ اس کی کتابیں اور تصنیفیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کا سائنسی آدمی تھا اور اس کی سائنسی ذہنیت کی پرداخت اس طرح ہوئی تھی کہ آج بھی زمانہ اس کی تعریف ایک استاد کی حیثیت سے کرتا ہے اصلیت تو یہ ہے کہ اس کی پوری زندگی علم کے کھوج اور اس کے

Marfat.com

حاصل کرنے میں صرف ہوئی۔

جس وقت سلطان محمود غزنوی ہندوستان پر حملہ آور ہو رہا تھا اس وقت البیرونی بنارس میں پنڈتوں کی شاگردی میں سنسکرت علم سیکھ رہا تھا۔ اپنے متعلق اس نے لکھا ہے کہ جب وہ علم سیکھنے کی غرض سے ہندوستان آیا تو بنارس کے پنڈتوں سے اپنی خواہش ظاہر کی کہ وہ سنسکرت پڑھنا چاہتا ہے۔ انھوں نے اس کو پڑھانے سے انکار کیا کیونکہ وہ اپنا علم کسی بدیسی کو نہیں دینا چاہتے تھے لیکن البیرونی کی علمی تڑپ اور تحقیقی جستجو سے بنارس کے پنڈت متاثر ہوئے اور اس بدیسی عالم کو اپنی علمی برادری میں لے کر اس کو ودیا ایسی دی جیسی کہ اپنے دیس کے علم کے پیاسے طالب علم کو دی جاتی ہے۔ اس طرح اس نے ہندی علم سیکھا اور آخر میں اس کے استادوں نے اس کو "ودیا ساگر" کا لقب دیا۔ البیرونی نے نجوم، ہیئت، جغرافیہ اور حساب کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں لکھیں۔ اس کی "کتاب الہند" ایک اونچی پدوی کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں البیرونی نے بحیثیت ایک ادیب کے نہیں بلکہ ایک محقق کے ہندوستان کی سچی تصویر کھینچی ہے جس میں ہندوستان کو ہندی نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے یعنی ہندوستانی اپنے ملک، اپنے مذہب، اپنے رسم و رواج، اپنے علم و ہنر، اپنی ریت، اپنے تہوار، اپنے تعصبوں کے متعلق کس طرح ظاہر کرتے ہیں اور ان کو زندہ رکھنے میں کیا کرتے ہیں۔ البیرونی نے "کتاب الہند" کی تمہید

Marfat.com

میں اس بات کو صاف کر دیا کہ وہ دراصل ہندوستان کا مطالعہ ایک تحقیقی نظر سے کرنا چاہتا ہے۔ ہندوستان کی تہذیب اور اس کے تمدن کا مقابلہ یونانی، ایرانی اور اسلامی تہذیبوں سے بھی کیا ہے۔ اس کو اس مطالعہ میں تہذیبوں کی یکسانیت دکھائی دی اور تضاد بھی جو مختلف ملکوں کے لوگوں میں ہوتا ہے لیکن کہیں بھی اس نے جذبۂ حقارت، نفرت اور تعصب کو اپنی تصنیف میں جگہ نہ دی کیونکہ اس کا علمی شعار یہ تھا کہ علم کی تحقیق میں انسان کو سچائی اپنی نظر کے سامنے رکھنی چاہیئے اور جہاں سچائی کی جستجو نہیں وہاں تحقیق نہیں اور جہاں تحقیق نہیں وہاں علم میں صداقت نہیں ہو سکتی۔ اس لحاظ سے البیرونی ہندی اور مسلمانی تہذیبی دنیاؤں کا بے مثل سفیر تھا جو ان دونوں کو قریب تر لانے میں، ایک دوسرے کو سمجھنے میں اور خصوصاً ایک ملک کے علوم دوسرے ملک کے علوم سے جو اپنی ملکی حد بندیوں سے آزاد ہیں، سچائی اور تحقیق کی بنیادوں پہ قائم کرنے میں اپنی زندگی کے مقصد کو پورا کرتا ہی نہیں ہے بلکہ اپنی بے مثل نظیر کو عالموں کی دنیا کے سامنے کسی پاس و لحاظ کے بغیر پیش کر تا ہے۔ اس کا غیر تعصبانہ علمی ذوق اور لگن اس وقت اور زیادہ نمایاں ہوا جب کہ سلطان محمود غزنوی ہندوستان پہ حملہ آور ہو رہا تھا اور جس کی وجہ سے ہندواسیوں کے دل پہ خراش ہی نہیں لگی بلکہ انسانی تعلقات میں بھی فرق آنے لگا تھا۔ لیکن البیرونی نے اپنے آقا کی حمایت اور تعریف نہیں کی۔

اس کو اس بات کا بے حد رنج تھا کہ سلطان محمود غزنوی کے حملوں سے ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور دشمنی پیدا ہو جائے گی۔

ان کتابوں کے علاوہ ہندوستان کے کھیل بھی مسلمانوں کو پہنچے یعنی شطرنج اور چوسر۔ یہ دونوں کھیل خالص ہندوستان کے دماغوں کی ایجادیں ہیں۔ یعقوبی سیاح مورخ اور عالم جس نے ۲۷۸ھ میں انتقال کیا اپنی ہندوستان کی افسانہ نما تاریخ میں لکھتا ہے کہ شطرنج اور چوسر محض کھیل نہیں ہیں بلکہ حساب اور ہیئت کے نازک مسئلوں پر ان کی بنیادیں رکھی گئی ہیں۔ بظاہر وہ حسابی مسئلوں سے متعلق ہیں لیکن دراصل وہ دو مذہبی یا فلسفیانہ دبستانوں کی تشریح ہیں۔ چوسر کا کھیل یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان دنیا میں جبر کے قانون کے ہاتھوں جکڑا ہوا ہے۔ اس کی قسمت اس کے ہاتھوں سے نہ بنتی ہے اور نہ بگڑتی۔ جو کچھ ہے وہ قسمت اس کو دیتی ہے۔ وہی پھل وہ پاتا ہے، اچھا ہو یا برا، جو اس کے نصیبے کا ہوتا ہے۔ انسان مجبور ہے۔ وہ دنیا کے میدان میں اپنا قدم خود نہیں اٹھاتا۔ اس کا ارادہ اور اس کی نیت اس کی نہیں، بلکہ کوئی بیرونی قوت اس کے پیچھے ہے جو مجبوراً اس کو آگے بڑھاتی یا اٹھاتی یا پیچھے لے جاتی یا گراتی ہے۔ اس کی زندگی مجبوریوں کی ایک زندہ مثال ہے۔ انسان جبر کے قانون کے تحت پیدا ہوا اور اسی قانون کے تحت اپنے دن کاٹ کر موت کے منہ میں جاتا ہے۔ شطرنج کا کھیل جبر کے خلاف اس بات

Marfat.com

کو ثابت کرتا ہے کہ دُنیا میں جو کچھ بھی ہے وہ انسان کی ذاتی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس کی عقلمندی، اس کی صلاحیت، اس کی تدبیریں، اس کی دور اندیشی، یہ تمام وہ قوتیں ہیں جو زندگی کو کامیاب بناتی ہیں، اس کی برتری کا سوال دراصل اس کی ذہنی اور احساسی قوتوں کے صحیح استعمال پر منحصر ہے۔ انسان کی کامیابی اور ناکامی، اس کے دل اور دماغ، اس کی سمجھ بوجھ، اس کی دوڑ دھوپ کا نتیجہ ہیں۔

الغرض یہ دونوں ہندوستانی کھیل زندگی کے دو پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے ایجاد کئے گئے تھے، تاکہ انسان ان کھیلوں کے ذریعے سے اپنے آپ کو سمجھے۔ یعقوبی کا کہنا ہے کہ ایک پنڈت نے چوسر ایجاد کر کے ایک راجا کو یہ کھیل نذر کیا تھا۔ اسی طرح دوسرے پنڈت نے شطرنج کو ایجاد کیا تاکہ مسئلہ اختیار کھیل کے ذریعہ سمجھا جائے۔ یہ کھیل بھی ایک راج کے لئے ایجاد کیا گیا تھا۔

Marfat.com

دوسرا حصّہ

ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول

دوسرا باب

عربی راج نظیتی

عام ہندوستانی کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں مسلمانی راج کی ابتداء غزنوی خاندان سے ہوئی لیکن اگر تحقیق کی نظر سے دیکھا جائے تو ہندوستان کی فتح کے سلسلہ میں جو ابتدائی قدم مسلمانوں نے اٹھایا تھا وہ غزنویوں سے بہت پہلے کا ہے۔ ہندوستان کی فتح کا خیال سب سے پہلے دراصل حضرت عمر کی خلافت کے دوران میں پیدا ہوا اور ایک فوجی مہم ہندوستان کے ساحلی علاقوں کی تسخیر کے لئے روانہ بھی کی گئی۔ لیکن خلیفہ وقت کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے فوری احکام جاری کئے کہ ہندوستان سے جہاد نہ کیا جائے۔ حضرت عثمان کے زمانہ میں اس خیال نے دوبارہ زور پکڑا اور ایک وفد

Marfat.com

ہندوستان کے صوبوں کی کھوج لگانے کی غرض سے بھیجا گیا تاکہ معلومات حاصل کرے لیکن یہ مہم کامیابی کا منہ نہ دیکھ سکی۔ نیز ساتویں صدی سے گیارہویں صدی تک مسلمانوں کی کوشش یہ رہی کہ ہندوستان فتح کیا جائے۔ اس سلسلہ میں انہیں دو راستوں سے اختیار کی گئیں ایک تو سمندری اور دوسری خشکی کے راستہ سے۔ سمندری مہم دراصل سندھ کی فتح ہے اور عربوں کا راج سندھ میں کئی سو سال تک رہا۔ جب سندھ فتح کیا جا رہا تھا تو اس وقت سپہ سالار لشکر محمد بن قاسم نے یہ اعلان کیا کہ جو لوگ ہماری امان میں آنا چاہتے ہیں اُن سے جنگ نہیں ہوگی اور ان کی جان و مال کی حفاظت ہمارا فرض ہوگا۔ سندھ کے لوگوں نے زندگی کے امن کو فوجی احکام کی تعمیل کر کے حاصل کیا۔ ملک فتح ہو جانے کے بعد سندھ میں اسلامی قانون کا دور دورہ رہا اور سندھی عربی حکومت نے رعایا کے ساتھ اسلامی انصاف اور رواداری برتی۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ عرب حکومت کے ساتھ سندھیوں کو بے حد لگاؤ پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ حاکم اور محکوم میں تہذیبی تعلقات کا رشتہ جُڑنے لگا۔ سندھ میں اس رشتے کی بنا پہ ایک نئی سندھی عربی تہذیب نے جنم لیا نتیجہ کے طور پہ یہ بیان کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ سندھی عربی تہذیب ان سماجی ملواں قوتوں کی زندہ مثال ہے جو سندھ میں اپنے تہذیبی سانچوں کے ساتھ عام زندگی کے بڑھاؤ اور پھیلاؤ میں صدیوں

Marfat.com

تک ڈھلتی رہی یعنی سندھی زبان، سندھی رسم ورواج، سندھی عقیدت نیز سندھی زندگی کے مختلف روپ اور پہلو، اس کے حرکات و سکنات عربی اور سندھی اثرات کا نتیجہ ہیں۔

عربوں کی وہ کوشش کہ خشکی کے راستے سے چڑھائی کرتے ہوئے ہندوستان پر قبضہ کریں کئی سو سال تک جاری رہی۔ ہندوستان کی سرحد تک اس زمانہ میں سیستان تک تھی اور اس کی تہذیبی وسعت میں سیستان کا علاقہ بھی شامل تھا۔ عربوں کو سیستان کی مہم میں کافی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا اور آخر میں ان کو کامیابی بھی ہوئی۔ سیستان کی فتح کے بعد عربوں نے اپنے سیاسی منصوبوں کو پورا کرنے میں کوئی کمی نہ کی بلکہ ان کے قدم بڑھتے بڑھتے کابل تک پہنچ گئے گو اس دوران میں ان کو اکثر شکستیں بھی ہوئیں ممکن تھا کہ اگر عرب حکومت کابل میں استحکام پیدا کر لیتی تو ہندوستان میں وارد ہونا عربوں کے لئے آسان کام ہو جاتا۔ لیکن تھوڑے عرصہ ہی میں کابل کے لوگوں نے اس کو نکال پھینکا اور ان کو اپنا سا منھ لے کر واپس ہونا پڑا۔ اس طرح کابل ہندوستانی اثر کے تحت کچھ عرصہ تک اپنی آزادی کو بحال رکھ سکا۔ دسویں صدی کے وسط میں سامی عملداری میں جو ایشیائے کوچک میں تھی کمزوری پیدا ہونے لگی۔ اس انتشار کے دور میں ان کے ترکی فوجی افسروں نے سر اٹھایا اور چھوٹی چھوٹی حکومتیں سامی بیکھتر کے وقار کو تسلیم

کرتے ہوئے قایم کیں۔ اس طرح غزنی کی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ غزنوی حکمرانوں کے پرتگین عہد میں ہندوستانی شاہ کابل اور غزنیوں کے درمیان فوجی آزمائش اس وجہ سے ہوئی کہ غزنویوں کے سیاسی اثر اور سنگھٹن کو توڑا جائے۔ اس واقعہ کے متعلق تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ تصادم ہندو اور مسلمانوں کا دراصل پہلا تصادم تھا۔ اس مٹھ بھیڑ میں غزنویوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ واقعہ اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ ہندوستان پر جن حملوں کا سلسلہ محمود غزنوی نے شروع کیا تھا وہ دراصل اسی ابتدائی سیاسی تصادم کا نتیجہ تھے۔ غزنی کے حکمرانوں نے اس بات کو بہت جلد محسوس کر لیا کہ ان کی حکومت کی بنیادوں میں استواری یا مضبوطی اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکے گی جب تک کہ وہ دولت حاصل نہ کریں اور سرحدی قلعوں پر قبضہ نہ کریں۔ ہندوستان کی سرحد غزنی کی ریاست کی سرحد سے ملی ہوئی تھی اور ان سرحدوں پہ بڑے بڑے ہندوستانی قلعے تھے۔ سلطان سبکتگین نے سب سے پہلے یہ کوشش کی کہ وہ ان قلعوں پر قابض ہو جائے۔ اس میں وہ کامیاب ہوا۔ قلعوں پہ قبضہ پانے کے بعد اس کا ارادہ کسی دوسرے منصوبے کو پورا کرنے کا ہوا۔ یعنی ہندوستان کی دولت حاصل کی جائے۔ یہ منصوبہ اس وقت ممکن نہ تھا جب تک بلوچستان کا علاقہ ان کے قبضے میں نہ آ جائے کیونکہ ہندوستان پر اسی راستہ سے حملہ ہو سکتا تھا۔ اس وقت ہندوستان کے سب سے بڑے

Marfat.com

راجہ جے پال نے بلوچستان کے علاقے کی طرف سے خدشہ محسوس کرتے ہوئے سیاست کاری کے جذبے کے تحت یہ علاقے افغانوں اور ترکی قبیلوں کو اس شرط پر عطا کیے کہ وہ ہندوستان کی سرحد کے محافظ بنیں۔ ان قبیلوں نے ہندوستانی سرحد کی حفاظت کی اور سبکتگین کی بڑھتی ہوئی قوت کو اکثر روکا اور اس کا مقابلہ بھی کیا لیکن جب فوجی دباؤ ان پر بہت زیادہ پڑنے لگا اور وہ اس کی تاب نہ لا سکے تو انھوں نے راجہ جے پال کی مدد چاہی۔ راجہ جے پال ان کی کمک کو نہیں آیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کی سرحد کی حفاظت افغانوں اور ترکیوں سے نہ ہو سکی۔ سبکتگین نے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے اصول پر عمل کر کے ہندوستان کی سرحدی قوت کو ختم کیا اور ہندوستان میں آنے کا راستہ صاف کیا۔

Marfat.com

تیسرا باب

غزنوی راج نیتی

یوں تو سلطان سبکتگین نے غزنی حکومت کی بنیاد کو مضبوط کیا تھا لیکن اس کی تعمیر اس کے بیٹے سلطان محمود کے ہاتھوں ہوئی۔ سلطان محمود غزنی خاندان کا وہ مشہور حکمراں گزرا ہے جس نے غزنی کو شہرت دوام دے دی۔ سلطان محمود غزنی روایتوں میں پلا تھا اور اپنے باپ کے اولوالعزم سیاسی منصوبوں سے بخوبی واقف تھا۔ یعنی غزنی کی عملداری، دباؤ اور بے جا فائدہ مندی ہندوستان کی دنیا کے لیے ضروری تصور کی گئی۔ محمود نے اپنے بچپن ہی سے ہندوستان کی دولت سے متعلق قصے اور کہانیاں سنے ہی نہیں تھے بلکہ وہ خوب جانتا تھا کہ غزنی حکومت کے ابتدائی دور میں ہندوستان کی دولت نے کیا کام انجام دیا تھا۔ غزنی حکمراں اس بات کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ جب تک غزنی دولتمند ریاست نہیں بنتی اس وقت تک اس کا

Marfat.com

رعب اور دبدبہ قرب و جوار کی اسلامی ریاستوں پر نہیں پڑ سکتا ہے
گیارھویں صدی کی سیاست کاری میں دولت اور سیاست ہم نام
اور ہم اصول شے سمجھے گئے تھے۔ دولت کے معنی سیاسی اقتدار اعلیٰ
یا کچھتری کے ہیں اور کچھتری بغیر دولت کے ممکن نہیں ہے۔ اسی
سیاسی فضا میں محمود کی تربیت ہوئی تھی نہ کہ اسلامی شعار اور اصول
کے تحت۔ اس کی ہوس سے متعلق جو قصے بیان کئے جاتے ہیں وہ
دراصل محمود کی اصلی طبیعت اور ذہنیت کو دکھاتے ہیں۔ محمود دراصل
تمام غزنی حکمرانوں میں سب سے حریص ترین آدمی تھا اور اس کے
ساتھ ساتھ اس کے دل میں سیاسی طاقت کو بڑھانے کا ایک پُرجوش
ولولہ بھی تھا جو اکثر اوقات اس میں سیلاب کی طرح اٹھتا تھا۔ لیکن
محمود کی سیاست کاریوں میں جس جذبے نے غلبہ حاصل کیا وہ دولت
کو اکٹھا کرنے کا تھا۔

۱۷

محمود نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے۔ یہ حملے مختلف نوعیت کے
تھے کیونکہ ان میں مختلف جذبے کام کر رہے تھے۔ اگر ان حملوں پر ایک
تحقیقی نظر ڈالی جائے تو محمود کے حملوں کو تین قسموں میں تقسیم کرنا پڑے گا
پہلے قسم کے حملوں کی نوعیت محض سیاسی و فوجی تھی۔ دوسرے قسم
کے حملوں میں سیاسی کچھتری کے سلسلے میں انتقامی جذبے تھے۔ تیسرے
قسم کے حملوں کی نوعیت معاشی تھی۔ فوجی حملوں میں سیاسی جذبات
کے علاوہ انتقام کا جذبہ کارفرما تھا کیونکہ غزنی اور ہندوستانی ریاستوں

کے مابین جو سیاسی معاہدے ہوئے تھے ان کی خلاف ورزی
کے سلسلے میں محمود نے ہندوستان پر حملے کئے۔ اپنی بالادستی یا برتری
کو تسلیم کرانا اس کا مقصد تھا۔ ہندوستان کے چند راجاؤں نے محمود
سے جو معاہدے کئے تھے وہ اس کے پیٹھ موڑتے ہی توڑ دیئے گئے
تھے۔ محمود کے اکثر حملے جذبۂ انتقام کے تحت ہوئے۔ لیکن ان کے
وہ حملے جو ہندوستان کی دولت کے لوٹ کے سلسلے میں ہوئے
ان کی نوعیت بالکل الگ تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ
ہندوستان کی دولت لوٹنا چاہتا تھا جس کے لئے اس نے کوئی دقیقہ
اٹھا نہ رکھا۔ اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ہندوستان کی دولت
کے خزانے کہاں کہاں صدیوں سے اکٹھے ہیں۔ یہ دولت کے
خزانے دراصل ہندوستان کے مندر تھے جن کی لوٹ کھسوٹ آسانی
سے ہو سکتی تھی۔ محمود نے جن مندروں کو لوٹا وہ زیادہ تر وہی مندر تھے
جو دولت کے مرکز تھے۔ ویسے تو ہندوستان میں دوسرے اور کئی مندر بھی
تھے جن کو محمود اپنی مہم کے دوران مسمار کر سکتا تھا لیکن ان کو اس نے
ہاتھ نہیں لگایا۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس نے دولت لوٹی اور دل
کھول کر لوٹی اور اس دولت کی لوٹ کے سلسلے میں مندروں کو مسمار
کیا۔ لیکن یہ خیال کرنا کہ وہ اسلام کی خدمت بحیثیت ایک زبردست
مبلغ کے کرتا تھا صحیح نہیں ہے۔ محمود اگر واقعی ایک سچا اسلام کا
پیرو ہوتا تو اس کی مہموں میں جو اس نے مسلمانی اور ہندوستانی علاقوں

Marfat.com

میں اختیار کیں بہت بڑا فرق ہونا ضرور تھا۔ اس نے ہندوستان میں وہی کیا جو اس نے مسلمانی علاقوں میں کیا یعنی بربادی، غارت گری اور لوٹ مار۔ اس کے رویّہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مسلک حکمرانی اور جہانبانی کے اصولوں کو قایم کرنا نہ تھا بلکہ وہ اپنی ریاست غزنی کو مالامال کر کے ممتاز شہنشاہیت کا مرتبہ دلانا چاہتا تھا۔ تاریخ یعطبی میں اس قسم کی شہادت ملتی ہے کہ اس کی مہموں میں خصوصاً ہندوستان کی مہموں میں جو جذبہ کام کر رہا تھا وہ مذہبی نہ تھا بلکہ سیاسی اور معاشی یعنی محمود نے خالص دنیا دارانہ ذہنیت اور جذبے کے تحت مہمیں سر کیں جیسا کہ تاریخ میں اکثر دنیا دار راجاؤں، مہاراجوں یا سلطانوں کے حالات ملتے ہیں جو محض اپنی ہوس کے پورا کرنے میں طرح طرح کے بے اصولیوں اور بے ضابطگیوں سے کام کرتے ہیں۔ ان ہی من مانے حکمرانوں میں محمود کا بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک مہاپرش ضرور تھا۔ اس کی ایک ایسی ہستی تھی جس نے اپنی دل کی خواہشوں کو من مانی طور سے نہ صرف ایک آمر کی حیثیت سے ہی پورا کیا بلکہ اس بات کا لحاظ کیے بغیر کہ آیا اس کا فعل یا عمل واجبیت کی کسوٹی پر کسا بھی جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس کی تمام کوششوں کا نتیجہ صرف ایک ہی نکلا کہ غزنی کو اس نے ایک امتیازی تہذیبی مرکز بنا کر شہرت دی۔ لیکن غزنی کو ایک بڑی عظیم الشان سلطنت میں تبدیل نہ کر سکا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ایک مرتبہ اس کو خیال آیا تھا کہ وہ اپنا راج

Marfat.com

ہندوستان میں قائم کرے لیکن اس کو پورا نہ کر سکا۔ محمود کی شخصیت اس اعتبار سے نرالی تھی کہ اس کے منصوبے بہت بڑے تھے، لیکن اس میں وہ صلاحیت اور دوراندیشی نہ تھی جو ایک سیاست داں انسان میں ہونی چاہیئے۔ وہ دنیا کا ایک بڑا سپہ سالار ضرور تھا لیکن ایک بڑی شہنشاہیت قائم کرنے کی قوت نہ رکھتا تھا۔ اس کی نگاہ میں غزنی کا مستقبل اور اس کی ترقی گھوم رہی تھی، نہ کہ ایک عالم گیر سلطنت کا خواب۔ غزنی حکمرانوں کی سیاسی تربیت دراصل ترکی روایات اور ماحول میں ہوئی تھی۔ گو غزنی کے لوگ دسویں صدی کی ابتداء میں مسلمان ہوئے تھے لیکن ان کی طبیعت، ان کا مذاق، ان کا جذبہ اور ان کی زندگی سب کی سب ترکی تھی لیکن سیاسی نشو و نما میں ایرانیت کا اثر نمایاں تھا نہ کہ اسلامی اصولوں کا۔ ہندی ریاستوں سے جو معاہدے محمود نے کئے ان میں کسی بھی قسم کی اسلامی جھلک اور اسلامی اصول نہ تھے بلکہ وہ اس زمانے کے عام سیاسی اصول کے تابع تھے۔ محمود کو اگر ایک مبلغ اسلام تصور کیا جا سکتا ہے تو اس کا رویہ اور عمل اسلامی شرع کے اعتبار سے ہونا چاہیئے اور اس کی حکومت اسلامی اصولوں پر کاربند ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن اس قسم کی شہادتیں غزنی کی تاریخ میں نہیں ملتیں۔ اس کے پیش نظر جو اصول ہمیشہ رہا وہ سیاست کاری یا راج کاری کا تھا۔ اس اصول کے تحت اس نے اپنی ریاست کو مضبوط بنایا۔ اس کی فوجوں میں یہی نہیں کہ مسلمان بھرتی کئے جاتے تھے بلکہ غیر مسلم بھی۔ یعنی ہندو

Marfat.com

جاٹوں کے جتھے اور پلٹنیں بھی تھیں جو اکثر اوقات مسلمانی علاقوں پر دھاوا بولنے کے لئے بھیجی گئیں۔ ان غیر مسلم پلٹنوں کے علاوہ غزنی فوج میں بڑے بڑے غیر مسلم افسر بھی تھے۔ یہ وہ فوجی افسر تھے جنھوں نے خاندان کے زوال کے آخر وقت تک وفاداری اور جانفشانی کے ساتھ ملک اور مالک کے لیے اپنی اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈالا۔ ان ہی افسروں نے غزنویوں کے آخری دور میں ہندوستان پر حملے کئے۔ جب کبھی فوجی بھرتی کی ضرورت حکومت کو ہوتی تو اس وقت ہندوستان ہی سے فوج بھرتی کی جاتی تھی۔ غزنی خاندان کی ایسی روایات تاریخ میں موجود ہیں۔ دوسرے لفظوں میں غزنی خاندان سے دراصل مسلمانی حکمرانی کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو رفتہ رفتہ غزنی کے مرکز سے ہٹتا ہوا ہندوستان کو اپنا مرکز قرار دیتا ہے اور صدیوں تک اپنی طاقت کو قایم کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

Marfat.com

چوتھا باب

غوری راج نیتی

غزنویوں کے بعد غوریوں کا دور شروع ہوا۔ یہ غوری بھی غزنی کی سیاسی روایتوں میں پلے تھے۔ ان کے تعلقات ہندوستان سے بالکل فوجی اور سیاسی نوعیت کے تھے۔ غوریوں کی ابتدائی سیاسی زندگی اکثر انقلاب سے گزری جس کی اصل وجہ سیاسی تنظیم اور دولت کی کمی تھی۔ غوریوں کی مہموں میں اکثر فوجی بھرتی کے سلسلے میں "اسلام خطرہ میں ہے" اور "جہاد فرض ہے" کی آوازوں کو اٹھایا گیا تاکہ ہندوستان پر حملے ہو سکیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو شاید ان کو فوجی بھرتی کی مہم میں کامیابی بھی نہ ہوتی کیونکہ فوجی بھرتی کے دوران میں سپاہیوں کو آس دلائی گئی کہ لوٹ مار میں جو دولت غوریوں کے قبضے میں آئے گی وہ اس سے مستفید بھی ہو سکیں گے۔ ان کو دولت کہاں تک ملی اور غوریوں نے ان کو کس حد تک دی تاریخ خاموش ہے

لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غوریوں کے حملوں میں سیاست کا عنصر بہت ہی نمایاں تھا اور مذہب دراصل ان کی فوجی تنظیم اور مہم کی آڑ تھا۔ یہ شہادت "طبقات ناصری" میں موجود ہے جو اس زمانے کی مستند تاریخ مانی جاتی ہے۔ غوریوں نے بھی غزنویوں کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا۔ ہندوستان کے حملوں میں ان کو اکثر شکست اور بعض مرتبہ کامیابی حاصل ہوئی لیکن جو چیز تعجب کی ہے وہ یہ کہ جب دیسی ریاستوں سے ان کے معاہدے ہوئے اور ان کے تعلقات قایم ہوئے وہ اسلامی نہ تھے بلکہ ہندوستانی مروجہ شرائط کے معاہدے تھے یا جو اس زمانے کی دنیا میں عام طور سے رائج تھے یعنی خراج دینا، ایک مختصر تعداد فوجی دستوں کے مرکز کے امان میں رکھنا اور شاہی خاندان کے شہزادوں کو بحیثیت مال غنیمت (HOSTAGES) رکھنا۔ اکثر یہ بھی ہوا ہے کہ غوری حکمرانوں نے شادی بیاہ کے تعلقات ہندوستانی رجواڑوں سے جوڑے، گو اسلامی معاہدوں کی شرطوں میں اس قسم کے اصول کہیں نہیں ملتے جیسے کہ غوریوں کے ہاں ملیں گے۔

غوری حکومت نے جو سیاسی تعلق ہندوستان سے پیدا کیا اس کو مضبوط تر کرنے میں قطب الدین ایبک کا مقام سب سے اول ہے۔ وہ ایک بڑا سپہ سالار ہی نہ تھا بلکہ تنظیمی صلاحیت کے اعتبار سے ایک مدبر بھی تھا۔ وہ ہندوستان کا پہلا مسلمان حکمراں ہے جس نے حکومت کا

Marfat.com

مرکز غزنی سے ہٹا کر ہندوستان میں قایم کیا۔ ہندوستان کی تاریخ کا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مسلمانی قوت اس بات کے درپے تھی کہ وہ اپنا ایک طاقتور مرکز بنائے لیکن اندرونی کمزوری کے باعث اس کو کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ غزنویوں سے لے کر غوریوں تک جو "حکمرانی" کا سلسلہ قایم تھا وہ محض فوجی قوت اور تنظیم کا مظاہرہ تھا نہ کہ ایسے سیاسی منظم اصولوں اور اداروں کا جس کی بنا پر حکومت میں استواری اور دیرپائی پیدا ہو۔ فوجی طبقے میں ہم آہنگی کے جذبے کی کمی اور آپس کا رشک و حسد اور راج و سیاست کی بنیادوں کو کمزور کرنے میں مدد دے رہا تھا۔ قطب الدین کو اسی مسئلہ سے دوچار ہونا پڑا۔ ممکن یہ بھی تھا کہ اس ابتدائی مسلمان حکمرانی دور میں آپس کی دشمنی اور ذاتی فائدہ مندی کے نتیجہ کے طور پر جو کشمکش ہوتی ہوئی نظر آئی وہ مسلمانی سلطنت کے خاتمہ کے لئے کافی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ شاہی کا ارادہ جنم نہ لے اور جمہور پسند راج قایم ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ترکی افسر قبیلی ہونے کے باوجود جمہور پسند بھی تھے۔ قطب الدین ایبک میں اس قسم کی صلاحیت اور اہلیت نہ تھی کہ وہ ان رجحانوں کا صحیح اندازہ لگا سکے۔ اس کی کوششیں صرف یہ تھیں کہ ہندوستان میں ایک طاقتور سیاسی مرکز قایم ہو جائے۔

قطب الدین ایبک کے بعد شمس الدین التمش کا زمانہ سیاسی رجحانوں کے تضاد کا ایک نازک دور تھا ان پر قابو پانا اس کے امکان

Marfat.com

سے باہر تھا۔ سیاسی نفاق کی خلیج کا پاٹنا ایک ایسا اہم اور ضروری کام تھا جس کو وہ پورا نہ کر سکا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس کی تربیت اور ترکی دلدادہ پن اس کے راستے میں حائل تھی۔ وہ صرف اسی بات میں کامیاب ہوا کہ ترکی جماعت کے احساسات اور جذبات کو کہیں ٹھیس نہ لگے۔ وقت کا تقاضا یہ تھا کہ ایک آمر کی حیثیت سے حکومت کے مسئلوں کی چھان بین کرے لیکن اس کے ترکی جذبات کی مجبوری نے اس کو ایسا کرنے سے روکا۔ حکومت کا فوجی طبقہ جو ترکوں پر مشتمل تھا وہ اپنی اپنی قوت قایم کرنے میں کوشاں تھا تاکہ حکومت ہاتھ میں آئے۔

پانچواں باب

بلبن شاہی

التمش کے نراجی دور کے بعد غیاث الدین بلبن ہندوستان کے تخت پر بیٹھا۔ بلبن ہی دراصل ہندوستان کا پہلا مسلمان حکمراں ہے جس نے مستحکم شاہی کو قایم کیا۔ وہ فطرتاً ایک آمر تھا اور اس کی آمری قوت ہی کا نتیجہ تھا کہ ملک کی نراجی قوتوں کا سدباب ہو سکا اور مسلمان شاہی جس میں اندر سے گھن لگ رہا تھا بچ سکی۔ بلبن نے اس بات کو بہت جلد محسوس کر لیا کہ مسلمان شاہی اور مسلمان حکمرانی پنپنا ممکن نہیں اگر آپس میں تضاد کی قوتیں ٹکراتی رہیں۔ بلبن کے شاہی نظریہ کا اندازہ تاریخ لیکھکوں نے غلط طریقہ سے لگایا اور غلط باور بھی کرایا کہ وہ ایک بے رحم آمر تھا جس نے من مانی حکومت کی۔ سیاسی حالات کی مجبوریوں سے وہ دوچار ہو رہا تھا جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ شاہی کے ارادے کو آمریت کی حیثیت ہی سے بچا جا سکتا تھا تاکہ سیاسی تضاد

Marfat.com

کا خاتمہ کیا جا سکے۔

بلبن وسطی عہد کا آدمی تھا اور اس زمانہ کی ذہنیت رکھتا تھا۔ اس کا عمل بھی اسی زمانے کے اصولوں اور ترکیبوں سے متاثر ہوا تھا جس رعب اور دبدبہ کی شاہی کا قیام اس کی آمری قوت کی بناء پر عمل میں آیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ ایک شاہ تھا جو محض رعب اور دبدبہ کے اصولوں پر حکومت کرنا چاہتا تھا، غلط فہمی پر مبنی ہے۔ مزاج کے زمانے کا توڑ دراصل رعب اور دبدبہ ہی سے ہو سکتا تھا لیکن بلبن نے جو ایک عملی انسان بھی تھا رعب اور دبدبہ والی شاہی کو تہذیبی بنیادوں پر کھڑا کیا اور اسے تہذیب و تمدن سے سنوارا۔ اس نے اکثر اپنے درباریوں کے سامنے اس تہذیبی شاہی مسلک کی تعریف بھی کی تھی۔ اس کے نزدیک شاہی دراصل خدا کا سایہ ہے اور خدا کی دی ہوئی ایک عظیم ذمہ داری بھی ہے جو حاکم وقت پر عائد ہوتی ہے۔ اس طرح وہ حاکم کی بے معنی حرکتوں اور کرتوتوں کی روک تھام کر کے اس کو تہذیب کے راستے پر چلنے کی ہدایت دیتی ہے۔ یعنی شاہی ایک امانت ہے جو خدا کی جانب سے اس بندہ کو دی جاتی ہے جو ایک حاکم کا درجہ رکھتا ہے تاکہ وہ خدا کے احکام پر خود عمل پیرا ہو کر انسانوں کو حکومت کے ذریعہ انصاف اور امن کے اصولوں کا پابند کرائے اور انسانی اصولوں کو جو دراصل خدائی اصول ہیں پیش نظر رکھتے ہوئے حکومت کرے۔ یہ نظریہ بلبن کی شاہی کا تھا، اور عملی انسان ہونے کی حیثیت سے اس نے

اس نظریہ پر عمل کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ طاقتوروں کی روک تھام، ظالموں کی سرکوبی اور غریبوں کی حفاظت کی گئی۔ اس طرح ملک میں امن قایم کیا گیا تاکہ غریب اور امیر، طاقتور اور کمزور اپنی اپنی زندگی اطمینان سے بسر کر سکیں اور ایک طبقہ اور دوسرے طبقے پر ظلم و ستم نہ کر سکے۔

بلبن کا زمانہ پُر امن دور سے گزرا جس میں راج کاری اصولوں کا تعلق مذہبی اصول سے نہ تھا۔ تاریخی شہادت یہ بھی بتاتی ہے کہ اس نے مذہب کے دخل کو حکمرانی معاملوں میں آنے ہی نہیں دیا بلکہ اکثر و بیشتر مذہبی اصولوں کو الگ تھلگ رکھا۔ وقت کا تقاضا تھا کہ وہ صرف راج کاری اصولوں کو فروغ دے۔

گو بلبن کی یہ دلی آرزو تھی کہ وہ ان بڑے بڑے "اسلامی" سلطانوں کے اصولوں پہ چلے اور اسلامی حکومت قایم کرے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ بلبن ایک اسلامی حکومت کو قایم کرنے میں ناکام رہا۔ اس نے حکمرانی سے متعلق جو اصول اختیار کئے تھے وہ امن و امان کے عام اصول تھے اور جن کا واسطہ اسلامی اصولوں سے بھی ہو سکتا تھا۔ بلبن کی دنیادارانہ پالیسی نے حکومت کی بنیادوں کو ان خدشوں اور خطروں سے بھی دور کیا جو مسلمانی راج کے ابتدائی دور میں تیزی سے اُٹھ رہے تھے۔ بلبن کی پالیسی کی کامیابی میں ایک امر کی چھپی ہوئی ہستی نہ تھی بلکہ اس میں سنگھٹنی صلاحیتیں بھی موجود تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ بلبن کے زمانہ میں حکومت کی رہنمائی کے لئے کوئی لکھت دستور نہ تھا بلکہ غیر لکھت قانون ملک میں رائج تھا

Marfat.com

جو صدیوں سے قانون کی شکل میں حکومت کے معاملوں کو طے کیا کرتا ہے لیکن ملک کی سیاسی حالتیں اور کیفیتیں اکثر اس زمانے کے حکمرانوں کو مجبور کرتی تھیں کہ وہ ایسے قانون اور قاعدے بنائیں جن کے اثرات کا نتیجہ دراصل ایک دستور کا ہونا تھا۔ عام طور سے یورپی ملکوں کے متعلق یہ خیال ہے کہ یورپ میں ہمیشہ سے ایک رحمدل جبریت قایم رہی اور اسی کا دور دورہ رہا لیکن اگر اس یورپی رحمدل جبریت کی تاریخ پہ ایک گہری نظر ڈالی جائے تو حالات یہ بتائیں گے کہ اس کا رویّہ محض جبر اور بے رحمی پر مبنی نہ تھا بلکہ زمانہ کے معیاروں کے مطابق جہاں بانی کا بھی پاس اور لحاظ رکھا گیا تھا۔ اس روشنی میں اگر بلبن کی شاہی کو دیکھا جائے تو اس کا شمار دنیا کے رحمدل آمروں میں ہو سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں بلبن ایک معیاری انسان ہونے کی حیثیت میں ناکام رہا لیکن عملی حکمراں کی حیثیت سے اس کی شاہی نے وہ کام کیا جو اچھی شاہیاں کیا کرتی ہیں۔

Marfat.com

چھٹا باب

کیقبادی شاہی

بلبن کے بعد تھوڑے عرصہ کے لیے کیقباد کی شاہی منظر عام پر آئی جو انسانی طاقتوں سے بھرپور تھی۔ تاریخ لکھنے والوں نے صرف اس کی عیش پسندیوں اور اس کے دور کی رنگ رلیوں کا ذکر کیا ہے اس عیش پسند انسان کی شخصیت کے دوسرے رُخ کا حال نہیں لکھا جو انسانی جوہر سے تعلق رکھتا ہے۔ بلبن شاہی ملک پر ضبط، رعب و دبدبہ، ڈر اور ہیبت پیدا کر گئی تھی اس کے خلاف جو ردعمل تھا وہ دراصل کیقباد کی شاہی تھی تاکہ رعب و دبدبہ کا دور رواداری، اُنس اور ہمدردی کے دور میں تبدیل ہو جائے۔ اس دور کی خصوصیت ایک نئی تہذیب کا جنم تھا۔ ملک میں امن کے اصولوں کے تحت ملواں کلچر اپنی شکل کو نکھارتا ہوا دکھائی دیا۔ یہی وہ ہندوستان کی تاریخ کا زمانہ تھا جب ہندی مسلم طاقتیں اور عناصر تہذیب کے میدان میں

Marfat.com

اپنے کمال کو ظاہر کر رہی تھی۔ امیر خسرو اسی زمانے کی ایک بے مثل ہندی مسلم ہستی تھی جس کی جئے جئے کے چرچے ہندوستان میں عام ہیں۔ اس کی نظر میں ہندوستان نعمتوں سے بھرا ہوا ایک جنتی ملک تھا۔ اس کے کلام میں ہندوستانی زندگی کے دلکش خاکے کھنچے ہوئے ملتے ہیں اور پڑھنے والوں پر ان کا اثر ایسا پڑتا ہے کہ وہ امیر خسرو کو ہندوستان کا ایک سچا پریمی مانتے ہیں۔ ہندوستانی (ہندی) زبان کی خوبصورتی، لطافت اور مٹھاس کا ذکر دراصل اسی انسان نے سب سے پہلے کیا تھا۔ اس نے اس میں کویتا بھی کہیں۔ اس لحاظ سے امیر خسرو ایک ہندی مسلم (ہندوستانی) زبان کا بانی سمجھا جا سکتا ہے۔

کیقباد کی زندگی اگر اوپری اعتبار سے جانچی جائے تو رومانی نظر آئے گی، لیکن اس میں ایک انسانی جیتی جاگتی ہستی اپنے اثرات کو سماج اور ملک پر ڈال رہی تھی۔ ایک عشرت پسند حکمراں کے دل میں اس خیال کا آنا کہ کسی کو ایذا یا تکلیف دینا انسانیت کے خلاف جرم ہے، تعجب کی بات ہے۔ کیقباد کی طبیعت میں اسی قسم کے جذبات اٹھا کرتے تھے اور وہ یہ کہا کرتا تھا کہ بادشاہ اور رعایا کی زندگی میں جو فرق ہے وہ اونچ اور نیچ مرتبے کا ہے، لیکن زندگی کی خوشیوں کے اظہار میں بادشاہ اور رعایا برابر کا حق رکھتے ہیں۔ رعایا اپنی خواہشوں اور امنگوں کو زندگی میں اسی طرح پورا کر سکتی ہے جیسے بادشاہ۔ انسانی خوشی کا حق محض بادشاہ کی حد تک

محدود نہیں بلکہ ہر انسان کو خوش ہونے اور خوش رہنے کا حق حاصل ہے۔ کیقباد نے اپنی رعایا کو اس طرح آزادی دی تھی۔

کیقباد کے زمانے میں بعض سیاسی مسئلوں پر بھی غور و فکر کیا گیا جیسے شاہی اور اس کے فرائض ملک کی خوش حالی اور حکومت کی تنظیم۔ شاہی کے فرائض کے سلسلے میں یہ بتایا گیا تھا کہ وہ اپنے نام اور وقار کو تب ہی بحال رکھ سکتی ہے جب کہ اس کی رعایا خوش حال ہو، اس کے تن پہ کپڑا، اس کے جسم میں آن پہنچ رہا ہو اور اس کے رہنے کے لئے مکان ہو۔ جس ملک کے لوگ بھوک اور غریبی سے بے چین ہو کر پریشان ہوں اور بے بسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں اس ملک کی شاہی بے کار ہے۔ شاہی کی کامیابی من مانی حرکتوں اور خود غرضی کے رویّہ کو چھوڑنے میں سمجھی گئی تھی۔ انسانی جذبوں سے بھری ہوئی شاہی کبھی وحشیانہ اور جابرانہ طور و طریق کی پابند نہیں ہو سکتی۔ شاہی کے زندہ رہنے کا طریقہ ملک کا مفاد، رعایا پروری اور داد رسی کی اسپرٹ ہے۔ سیاسی مسئلوں کے چھان بین کے سلسلے میں ملک کے مفاد پر یہ روشنی ڈالی گئی کہ ایک خود دار شاہی کو بے بس اور بے دم کرنے کی تدبیریں کیا ہو سکتی ہیں اور یہ بتایا گیا کہ شاہی مشورے اور صلاح کے بغیر اپنے ایک ذرّے عیب کو دور نہیں کر سکتی۔ اس میں نظر کی گہرائی، ہمدردی کا جذبہ اور جہاں بانی کا خیال تب ہی پیدا ہو سکتا ہے جب کہ وہ حکمرانی کے معاملات میں اپنے جہاں نتریوں

منتریوں اور ملک کے بڑے لوگوں سے مشورہ اور رائے لے۔ تاریخی شہادت یہ پتہ دیتی ہے کہ اس بحث و مباحثہ کے دوران میں اس خیال پہ بھی زور دیا گیا کہ شاہی کسی "دستور" کی پابند ہو تاکہ وہ من مانی طور پر اپنے طرز اور طریق کو اختیار نہ کر سکے۔

Marfat.com

ساتواں باب

خلجی شاہی

کیقبادی دور کے خاتمے پہ خلجی شاہی کا زمانہ شروع ہوا۔ خلجی خاندان میں خاص صفتوں کے انسان پیدا ہوئے۔ جلال الدین خلجی ایک انسان پسند حاکم تھا۔ اس کے زمانے میں راج سے متعلق اس قسم کا مسئلہ اٹھا کہ آیا شاہی مطمح نظر ملک گیری کے سوا اور کچھ بھی ہے جلال الدین خلجی محض ملک گیری کو غارتگری سمجھتا تھا۔ اس لئے اپنے فوجی افسروں کی ایک جماعت سے کہا کہ ان کے جنگی اصولوں کی اہمیت اس کی زندگی میں نہیں ہے اور جس ملک کے حاصل کرنے کی خواہش ان کے دل میں ہے وہ اس کا قائل نہیں ہے اور ان کو اپنے ذہن سے یہ خیال نکال دینا چاہیئے کہ اس کی شاہی سلطان سنجر اور سلطان محمود جیسی ہے۔ ایسے منصوبے ان ہی کے منہ بھلے معلوم ہوتے ہیں نہ کہ جلال الدین کے۔ اسی بات چیت میں اس نے اس خیال کا بھی

اظہار کیا کہ ملک گیری دراصل انسانوں کی خوں ریزی ہے اور خدا کے بندوں کا خون ناحق بہانا ناجائز ہے۔ ایسے کام ایک شاہ کی ہوس کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر ملک گیری شاہی کا واحد مقصد ہے تو اس کو ایسی شاہی سے کوئی سروکار نہیں اور وہ بخوشی ایسی شاہی سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے۔ اسی سلسلے میں اُس نے یہ بات بھی صاف کردی کہ وہ ایک سچے مسلمان ہونے کی حیثیت سے بے گناہوں کا خون ملک گیری کی ہوس میں نہیں بہا سکتا اور اسلامی احکام کی رُو سے انصاف اور رحم شاہی کا کام ہے نہ کہ جبر اور ستم۔

جلال شاہی کی خوبی یہ تھی کہ اس میں اہنسا کے خیالات تھے۔ گو جلال الدین کی تمام عمر لڑائی کے میدان میں کٹی تھی لیکن ایک انسان کی حیثیت سے اس نے اپنی طبیعت پہ جنگجویانہ اثر نہیں آنے دیا۔ شاہی کا درجہ حاصل ہونے کے بعد بھی وہ انسانی اصولوں پہ کاربند تھا جس کو اس نے اسلامی رنگ میں رنگا۔ تلوار کے زور کے بغیر اس کی شاہی انسانی طاقتوں کے بڑھانے میں کامیاب ہوئی۔ تاریخ پہ ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے ہم اس نتیجے پہ آتے ہیں کہ اس کے راج میں انسانیت کا اصول بہت ہی نمایاں طور پہ نپیتا دکھائی دیا۔ حکومت کے کاروبار انصاف کے بغیر ممکن نہ تھے اور سرکاری افسروں کی مجال نہ تھی کہ وہ رعایا کے معاملات میں غفلت، بے پروائی اور بے اعتنائی برتیں۔ اگر کبھی ایسا ہوا بھی تو ان کو بدنامی کا داغ لگ جاتا تھا۔ اس زمانے کی

شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی سرکاری افسر اس طرح بدنام ہو جاتا تھا تو اس کو اپنی نوکری مجبوراً چھوڑنی پڑتی تھی اور وہ اپنے کو اس قابل نہ سمجھتا تھا کہ حکومت کے کاروبار انجام دے سکے۔ اگر یہ واقعات صحیح ہیں تو ان سے اس امر کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ عوام کا دباؤ راج پاٹ پر پڑتا تھا اور ان کی رضامندی اور خوشی راج کی پالیسی میں اثر پذیر ہوتی تھی۔

کیقباد کی چلائی ہوئی تحریک کو راج پاٹ کے معاملوں کی انجام دہی میں جلال الدین کے ہاتھوں تقویت پہنچی ہے۔ گو جلال الدین کے زمانے میں استواری اور پائیداری پیدا ہوئی لیکن جلال الدین کی شاہی اسلامی رواداری، اہنسا اور رحم پر مبنی تھی۔ وہ انسانی زندگی کی محافظ تھی۔ لہٰذا ظلم سے پرہیز اور انسانیت کا درس اس کے دور کی خصوصیت تھی۔ یہاں تک کہ جب سیاسی قیدی اس کے سامنے گرفتار ہو کر لائے جاتے تھے تو وہ ان کو رہا ہی نہیں کرتا بلکہ اپنی نصیحت سے ان میں اپنے جذبات بھی پیدا کرتا تھا جس سے باغی شرم میں ڈوب جاتے اور اپنی حرکتوں پر نادم ہوتے۔ جلال الدین کے ایسے غیر سیاسی طریقہ عمل سے ظاہر ہے کہ وہ سیاسی قانون اور ضابطے کو لغو اور بے معنی سمجھتا تھا کیونکہ اس کی نظر میں ظلم، سختی اور بے رحمی شاہی کا شیوہ نہیں ہے۔ اس طرح سیاسی گمراہ انسان بچائے جا سکتے ہیں اور سیاسی گمراہی کی سزا جان کا لینا نہیں بلکہ ان کے ساتھ اہنسا کا سلوک کر کے ان کی

Marfat.com

تہذیب کرنا ہے۔

جلال الدین خلجی کے قتل کے بعد علاء الدین گدی پر بیٹھا۔ یہ حاکم سیاسی سمجھ بوجھ کا ایک سلجھا ہوا انسان تھا۔ اس نے شاہ بننے کے خواب اپنی ابتدائی زندگی میں دیکھنے شروع کئے تھے۔ جب سے وہ کڑے کا صوبہ دار بنایا گیا تب ہی سے اس کے دل میں شاہی کی امنگیں اٹھیں اس کی ابتدائی فوجی مہمیں شاہی کے راستے کی تلاش کا ایک سلسلہ تھیں ان تمام جنگی مہموں میں اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ دولت حاصل ہونے پر شاہی کا راستہ صاف نظر آئے گا۔ اس کی نظر میں دولت اور شاہی ایک دوسرے سے بہت ہی قریب کا تعلق رکھتی اور لازم و ملزوم ہیں دوسرے لفظوں میں دولت شاہی ہے اور شاہی دولت۔ دولت کی قوت سے شاہی حاصل نہیں ہوتی بلکہ عوام بھی رام کئے جا سکتے ہیں۔ ہر قسم کی مخالفتیں، فوجی، عوامی اور ملکی اس قوت کے ذریعے توڑی جا سکتی ہیں۔ علاء الدین کی زندگی دراصل اسی خیال کی ایک انوکھی داستان ہے جو "دولت کے بھوت" کے تماشوں کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کی ہر سیاست کاری میں دولت کا کوئی نہ کوئی اثر دکھائی دیتا ہے۔

علاء الدین کو دولت کے بل پہ شاہی تخت نصیب ہوا اور دولت بچھاور کر کے عوام کی مخالفت اور دشمنی کو ختم کیا اور خوشنودی بھی حاصل کی۔ علاء الدین کی شاہی راج کے مسئلوں سے دوچار ہونے میں اس طرح کامیاب ہوئی کہ امیری طبقوں کی سازشی قوت کا مقابلہ "دولت کے

Marfat.com

قانون" سے کیا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ امیروں کی دولت ان میں باغیانہ جذبات اور گروہ بندی پیدا کرتی ہے اس لیے دولت کے چھن جانے پر نہ ان میں سکت رہے گی اور نہ ہمت کہ وہ سازش کر سکیں یا سر اٹھا سکیں۔ راج سے متعلق زمین اور لگان کے مسئلے علاء الدین کو دق کرنے لگے۔ اس کی سرکار کو اکثر و بیشتر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لگان یا محصول وصول کرنے کے سلسلے میں افسروں کو جب بھیجا جاتا تھا تو جاگیردار اور زمیندار ان کو بے عزت کر کے نکال دیا کرتے تھے جس سے علاء الدین کے راج کی بے قدری ہوتی تھی اور باغیانہ عمل بڑھتا تھا۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ حکومت کے مقابلے میں چھوٹی چھوٹی حریفانہ طاقتیں پیدا ہو گئیں۔ علاء الدین کی پالیسی پر جو جبر و تشدد کا الزام لگایا جاتا ہے وہ اس زمانے کے ان حالات کی مجبوری کا نتیجہ تھا۔ اگر علاء الدین حکومت کے خلاف اٹھتی ہوئی طاقتوں کا سختی سے مقابلہ نہ کرتا تو نہ اس کا راج رہتا اور نہ اس کی شاہی۔ اس نے خلاف شاہی طاقتوں کے توڑ کے سلسلے میں جو سماج نیتک کارروائیاں کیں ان کا یہ اثر ہوا کہ ملک میں طاقتور اور کمزور اپنے اپنے مقام پر رہے اور ملک میں امن قایم ہوا۔ علاء الدین کی راج نیت سدھار کوششوں کو اسی نقطۂ نظر سے جانچا جا سکتا ہے مثلاً ملک کی راتب بندی کی تحریک سیاسی مجبوریوں کا سبب تھی نہ کہ محض معاشی سدھار کا نتیجہ۔ بعض تاریخ کے لیکھکوں نے علاء الدین کے اس معاشی سدھار

Marfat.com

کے متعلق لکھا ہے کہ وہ سماج برابری کے اصول کو رائج کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اصلیت یہ نہ تھی۔ وہ دراصل سیاسی حالات کی مجبوری کی پیداوار تھی گو ملک پر ایسے قانون سے سماج برابری کا اثر پڑا۔ علاءالدین کی شاہی کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے جو راج نیتک اصولوں پر اچھی خاصی روشنی ڈالتا ہے۔ مذہب اور راج نیتی کے انتر بھید کا زندہ نمونہ علاءالدین تھا۔ اس کی نظر میں مذہب کی دنیا اور راج نیتی (سیاسیات) کی دنیا بالکل الگ الگ تھی۔ مذہب کا سمبندھ انسان کی سماجیک اور معاشی زندگی سے ہے نہ کہ حکومت اور راج سے۔ ان دونوں کو ملانے سے نہ مذہب پنپتا ہے اور نہ راج نیتی ترقی پاتی ہے۔ راج نیتی کا کام حکومت کو صحیح راستے پر چلانا اور مضبوط کرنا ہے۔ راج اپنی نیتی پر چل کر ہی ترقی کی راہ پر لگ سکتا ہے۔ مذہب کا دباؤ اس کے کاموں میں حرج پیدا کرتا ہے اور اس کی آزادی میں رخنہ بھی۔

علاءالدین کے دربار میں عالم اور قاضی موجود رہتے تھے جن پر زیادہ تر دہشت طاری رہتی تھی اور حاکم وقت کے سامنے منہ کھولتے ہوئے ڈرتے تھے۔ ایک مرتبہ علاءالدین نے قاضی مغیث سے دریافت کیا کہ جب وہ فوجی مہم اٹھاتا اور ملک فتح کرتا تو کیا اس کا رویہ اسلام کے قانون کے مطابق ہوتا ہے یا نہیں؟ اور یہ بھی دریافت کیا کہ لوٹ اور غارت گری کے سلسلے میں جو مال اور دولت اس کو ملتی ہے وہ شریعت کی رو سے شاہ کی ملک سمجھی جا سکتی ہے یا نہیں؟ قاضی

Marfat.com

مغیث نے ڈرتے ڈرتے ادباً عرض کیا کہ اگر حضور جاں بخشی فرمائیں تو شریعت کا فیصلہ سُنانے کی جرأت کرے۔ علاء الدین نے جاں بخشی کا حکم دیتے ہوئے کہا کہ قاضی نڈر ہو کر اسلام کے قانون کی وضاحت کرے۔ قاضی مغیث نے شریعت کی رو سے یہ بیان کیا کہ حضور کا یہ رویہ اور عمل اسلام کے قانون کے خلاف ہے کیونکہ جب اسلام کا لشکر مال غنیمت لے کر واپس آتا ہے تو حاکم صرف ایک چوتھائی حصہ کا حقدار ہوتا ہے اور باقی تین چوتھائی حصہ فوج میں تقسیم ہوتا ہے۔ حضور تمام غنایم بیت المال میں داخل کر دیتے ہیں جو شریعت کے خلاف ہے۔ یہ سن کر علاء الدین نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا اور کہا کہ قاضی تو ایک عالم ہے جس نے شریعت کے متعلق کتابیں پڑھی ہیں لیکن راج پاٹ کے معاملوں سے ناواقف معلوم ہوتا ہے علاء الدین نے اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ عالم نہیں ہے اور نہ وہ اسلام کے قانون سے واقف ہے لیکن حکمرانی کے قانون کو سمجھتا اور جانتا ہے۔ اس نے کہا کہ اگر ہندوستان میں شریعت کی رو سے حکومت کی جائے تو ہندو اور مسلمان کبھی سیدھے راستے پر نہیں آئیں گے اور حکومت کے خلاف سازش کرتے رہیں گے۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اس میں مصلحت اور حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس کو یقین تھا کہ ہندو مسلمانوں کے فتنے اور کسی طریقے سے دور نہیں کئے جا سکتے سوائے سیاسی تدبیروں کے۔ آخر میں اس نے کہا کہ اس کے

پیش نظر جو مسلک ہے وہ ملک اور لوگوں کی بھلائی ہے اور اسی جذبے کے تحت وہ تمام کام انجام دیتا ہے۔

کیقباد کے زمانے سے ہندوستان میں ہندو مسلم کلچر کی میل جول نظر آرہا تھا۔ اس تحریک کو خلجی عہد میں بھی فروغ حاصل ہوا شاہی درباروں اور سرکاری ملازمتوں میں ہندوؤں کا اثر رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔ شاہی محلوں میں بھی اس قسم کے اثرات شدت سے رونما ہونے لگے۔ آپس کی دوستی اور رواداری اور بھائی بندی کی ابتدا اسی زمانے سے ہوتی ہے۔ علاءالدین کے بعد حکومت کی باگ ڈور مبارک شاہ کے ہاتھ میں آئی۔ اس کے دور میں خصوصاً ہندوؤں کا غلبہ شاہی انقلاب کا باعث بنا۔ مبارک شاہ کی تخت نشینی میں ملکی ہندو عنصر کام کرتا دکھائی دیا گو اس کے راج کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے سوائے اس کے ہندو اثر راج نیتی پہ پڑا تھا۔

Marfat.com

آٹھواں باب

تغلق شاہی

خلجی خاندان کے خاتمے پر تغلق شاہی قائم ہوئی۔ تغلق حکمراں تمدنی اور کلچری مسلکوں کے حامل تھے۔ غیاث الدین تغلق کی شاہی کے حکومتی انتظام کے ذریعہ ملک میں امن و امان قائم ہوا اور عام فضا میں درستی ہوئی۔ اس نے شاہی میں ایک بہت بڑی ذمہ داری محسوس کی تھی جو روشن خیالی، عقلمندی اور دور نظری کے بغیر پوری ہونی مشکل ہے۔ شاہ کو محض ایک محافظ کی حیثیت سے دیکھنا راج پاٹ کے کاموں کو ادھورا رکھنا ہوگا۔ رعایا کا امن اور چین شاہی قابلیت، ہمدردی اور انصاف کا محتاج ہے۔ جلال الدین کی طبیعت میں انصاف پسندی کے علاوہ حکومت کو بہتر بنانے کی خواہش بھی تھی۔ اس کی شاہی کا محرک طاقتور اور کمزور کے مابین انصاف اور رواداری کے اصول قائم کرنا تھا۔ وہ جنگجویانہ مسلک

Marfat.com

کا قائل نہ تھا گو اس کی فوجی کارروائیاں زمانے کی مجبوریاں تھیں بھلائی اور بہتری کے مدنظر سرکاری افسروں کی چوکسی اور نگرانی کی تاکہ ظلم اور ناانصافی کی روک تھام ہو۔ غیاث الدین تغلق کی "روشن خیالی" اس کے حکومتی انتظام کے اصولوں میں نظر آتی ہے۔

غیاث الدین کے بعد اس کا بیٹا محمد تغلق گدی پہ بیٹھا۔ وہ دنیا کی ایک عجوبہ ہستی تھی۔ اپنے زمانے کا مانا ہوا ادیب، حساب داں منطقی اور دلکش بات چیتی انسان تھا۔ اس کے من میں جدت پسندی کی اُمنگیں اٹھا کرتی تھیں اور اس کا خیال اور نظریے ان سے متاثر بھی ہوئے تھے گو زمانے نے اس کو جنم دیا تھا لیکن وہ اپنے زمانے کا آدمی نہ تھا۔ اس کی نظریں آنے والے زمانے کی طرف اشارہ کرتی تھیں۔ اس کی کوشش انسانوں اور اداروں کو نئے ڈھنگ اور نئی ریت سے چلانے کی تھی لیکن اس کی جدت پسندیاں نہ اس زمانے کے مطابق تھیں اور نہ ان کو انسان کی جانب سے داد ملی۔ تاریخ میں محمد تغلق کے انوکھے طریقوں کو بیجا طور سے اچھالا گیا ہے جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کی جدت پسندانہ ہستی کا صحیح اندازہ نہیں لگایا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ دلی کے تخت پہ شاید کبھی کوئی ایسا جدت پسند حکمراں بیٹھا ہو جیسے کہ محمد تغلق تھا۔ جس کی شاہی نئے خیالوں اور نئی روشوں سے بھرپور تھی۔ وہ ان کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ اس کی بدبختی یہ تھی کہ وہ ایسے زمانے میں پیدا ہوا جس پر انتہائی قدامت پرستی

چھائی ہوئی تھی۔ محمد تغلق نے اپنے راج کے دوران میں شاہی کے تہذیبی مسلک کو اس غرض سے پیش کیا تھا کہ وہ ملک کی فضا اور لوگوں کی زندگی میں ایک گہری تبدیلی پیدا کرے۔ اس کے سکون پہ اگر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا مقصد رعایا میں وفاداری کے جذبہ کو پھیلانا تھا تاکہ عام زندگی میں وفادارانہ اظہار ہو سکے۔ اور شاہ اور جنتا میں اتحاد اور دوستی کے رشتے کی نئی بنیاد پڑے اس طرح راج میں پائیداری اور استواری قائم ہو سکتی ہے۔

محمد تغلق کی زندگی میں مایوسیاں زیادہ تر مختلف طبقوں کے باغیانہ طرز کا نتیجہ تھیں۔ اس کا غضب حد بندیاں توڑ کر اس وقت دکھائی دیتا تھا جب کہ اس کی مہربانیوں، عنایتوں، رحمدلی اور رواداری سے فائدہ اٹھا کر سازشی اور باغی بے جا حرکت میں مبتلا ہوتے تھے۔ یہ اس کی شومی قسمت تھی کہ اس نے جن جن لوگوں اور طبقوں کے ساتھ نیک سلوک اور اچھا برتاؤ کیا انھوں نے ہی اس کو دھوکا دیا۔ محمد تغلق کی طبیعت میں عوام پسندی کا جذبہ بھی تھا۔ عام انسانی جوہر کی بربادی کے مظاہرے اس کی نگاہ میں گھوما کرتے تھے۔ اس کو اس بات کا خیال ہوا کہ سماج کے دبے ہوئے انسانوں کو اٹھایا جائے۔ اس زمانے میں اور عام طور سے بھی آمر طبقہ (ارسٹوکراسی) یہ سمجھتا ہے کہ انسانی جوہر صرف اعلیٰ سوسائٹی کے افراد میں ہی ملتے ہیں اور اس طبقے میں پروان چڑھتے ہیں۔ اور یہی تہذیبی ورثہ مخصوص انسانوں کا ہے۔ لیکن محمد تغلق

Marfat.com

کا خیال تھا کہ انسانی جوہر ہر انسان میں موجود ہے خواہ وہ اعلیٰ یا ادنیٰ طبقے کا انسان کیوں نہ ہو۔ اس انسانی جوہر کی پرداخت اور نگہبانی کو وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس نے اپنے دور حکومت میں سماج کے گرے ہوئے طبقوں کی سرپرستی کی۔ ایسے طبقے کے لوگوں میں جب اس نے انسانی جوہر دیکھے تو ان کو اونچی پدویاں دیں۔ صلاحیت اور قابلیت کی بنا پر ان کو مرتبہ نصیب ہوا۔ لیکن اس زمانے کی ارسٹوکراسی نے محمد تغلق کے اس رویہ کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا اور اس کو بدنام بھی کیا کہ وہ ارسٹوکراسی کا دشمن ہے اور ادنیٰ انسانوں کا سرپرست لیکن جس خیال نے اس شاہی ہستی کو متاثر کیا تھا وہ سماج کے مقررہ اونچ اور نیچ کے اصول نہ تھے بلکہ انسانی کمال اور جوہر کی جانچ کے اصول تھے۔ محمد تغلق کے خلاف جو سازشیں ہوئیں ان میں اس جذبے نے بھی کام کیا۔ اس نے اعلیٰ سماج کے انسانوں کی عزت اس وجہ سے نہیں کی کہ وہ اعلیٰ سماج کے انسان ہیں بلکہ وہ انسانیت کے اچھے نمونے ہیں یہی اس کا شعار تھا۔ محمد تغلق کی طبیعت کا دوسرا پہلو بدیسیوں سے محبت اور ہمدردی کا جذبہ ہے۔ ہندوستان کے حاکموں میں سے یہ پہلا انسان تھا جس کو بدیسی بے حد عزیز تھے۔ سچے پریمی کی حیثیت سے اس نے ان کی آؤ بھگت کی، ان کو ملازمتیں دیں، ان کو اعلیٰ مرتبے دیئے اور ان کو طرح طرح کی مراعات بخشیں۔ اس بدیس پرستی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک میں بدیسی بڑی تعداد میں آئے لیکن

Marfat.com

ان کی آمد سے ہندوستانی سماج پر اچھا اثر نہیں پڑا۔ ملک والوں کے دلوں میں ان کے خلاف آگ بھڑکنے لگی۔ حکومت کے خلاف جو سازشیں ہوئیں ان میں اس جذبۂ نفرت نے بھی کام کیا اور طرہ یہ کہ ان بدیسیوں نے بھی محمد تغلق کا نمک کھا کر اس کے خلاف بغاوت کا پرچم اٹھایا۔ بدیسی اور ملکی مفاد کی ٹکر سے ملک میں نراج پھیلنے لگا اور عام بے چینی کے آثار نمودار ہوئے۔

ملکوں کی فتح اور ان پر قبضہ یعنی جہانگیری مہم محمد تغلق کی شاہی کا مسلک تھا۔ اس نے ملک فتح کئے، حکومت کے حدود بڑھائے، لیکن دلی کی راجدھانی کو مرکز بنا کر وہ اطمینان سے حکومت نہیں کر سکتا تھا اس کا خیال تھا کہ ایک ایسی نئی راجدھانی بنائی جائے جو ملک کے تمام حصوں کا مرکز ہو۔ اسی خیال نے محمد تغلق کو دق کرنا شروع کیا اس تجویز کے تحت اس نے راجدھانی کی تبدیلی کی اسکیم اٹھائی جو بادشاہت کے اصول کے لحاظ سے غلط نہ تھی اور نہ ناسمجھی پر مبنی تھی۔ دلی کی راجدھانی دولت آباد (دکن) میں منتقل ہوئی لیکن دلی کو اجاڑنے اور دولت آباد کو بسانے کے سلسلہ میں جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ دانشمندانہ قدم نہ تھا۔ گو اس نے راجدھانی کے تبادلے کے سلسلے میں ہر ممکنہ انتظام کرائے تبادلہ مختلف منزلوں میں ہوا تھا تاکہ دلی والوں کو راستے میں کھانے پینے اور رہنے کی تکلیف نہ ہو۔ تمام خرچے کا بوجھ حکومت کی جانب سے اٹھایا گیا۔ لیکن نہ دولت آباد بن سکا اور نہ اجڑی ہوئی دلی پھر سے

Marfat.com

آباد ہو سکی۔

محمد تغلق کی شاہی کے تجربے اس کی خصوصیت تھے نئی باتیں نئے خیال، نئے طریقے اور نئے قاعدے کو رواج دینے کی اس کے دل میں تمنا تھی۔ اس نے راج پاٹ کے معاملات میں بھی جدت پسندی دکھائی مثال کے طور پر نئے سکہ کا رائج کرنا جو سیاسی اور معاشی اصول کے تحت ایک ٹھیک قدم تھا۔ دوسرے ملکوں نے بھی اس طرح کے تجربے کئے تھے اور وہ کامیاب بھی ہوئے تھے لیکن محمد تغلق کے زمانہ میں یہ تجربہ ناکام رہا۔ اس کی ناکامی کی وجہ اصول کی غلطی نہ تھی بلکہ لوگوں کی غیر دانشمندی اور بے اعتمادی تھی۔ مطبقات اکبری میں اس نئے سکہ کی اجرائی کے سلسلے میں محمد تغلق کی سیاسی دوراندیشی اور سمجھ بوجھ کو اس خیال کے تحت سراہا گیا کہ وہ سونا محفوظ کر کے اپنے سیاسی منصوبوں کو آئندہ پورا کرے۔

اس طرح محمد تغلق کا ہمدردانہ رویہ جو جنتا کی بھلائی یعنی ان کی مصیبت دور کرنے کے سلسلے میں اختیار کیا وہ بھی تلخی، مایوسی اور رنج میں بدل گیا۔ قحط سالی کے زمانے میں شاہی احکام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رعایا پروری کے جذبے میں عملاً ڈوبا ہوا تھا اور اس کی ہر ممکنہ کوشش تھی کہ وہ اپنی رعایا کے آڑے وقت میں کام آئے لیکن افسروں کی بے وفائی، بد دیانتی، مکر و فریب اور رشوت ستانی کی وجہ سے مفلوک رعایا کو وہ راحت، اطمینان نصیب نہ ہو سکا اور وہ تسکین اور حفاظت حاصل نہ ہو سکی جو قحط سالی کے وقت ہر فرد بشر

کو حکومت کی جانب سے حاصل ہونا چاہئے تھی۔ اس میں محمد تغلق کا قصور نہ تھا اس کے زمانے نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ یہی اس کی بدبختی تھی۔

محمد تغلق ایک غیر معمولی حرکیاتی آدمی تھا۔ وہ سیاسی امور میں محو تھا اور راج پاٹ کے مفاد کو دراصل اپنا مفاد سمجھتا تھا اور جو کچھ بھی اس سے بحیثیت ایک انسان اور شاہ کے ہو سکا اس نے کیا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اس کے باوجود راج میں بغاوت کی آوازیں اٹھنے لگیں اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ ریاست کا ڈھانچہ پاش پاش ہو جائے گا۔ چاروں طرف بے چینی اور خطرے بڑھتے گئے۔ یہ دیکھ کر اس نے ہار نہ مانی بلکہ اس بات کی کوشش کی کہ خلافت سماجی اور نراجی طاقتوں پر حاوی ہو۔ ترکیبیں اور تدبیریں اختیار کی گئیں تاکہ ملک کے سیاسی نراج کو روکا جائے لیکن ہر کام اوندھا ہو گیا۔ اس ضمن میں اس نے ایک مرتبہ ضیاالدین برنی سے اپنی درد بھری کہانی یوں سنائی کہ تو نہیں دیکھتا کہ ملک میں انقلاب پہ انقلاب اٹھتا آ رہا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر کوئی خوشی نہیں ہوتی کہ لوگ عام طور پر یہ کہہ رہے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ میری سختی کی وجہ سے، لیکن میں اتنا کہوں گا کہ میں سزائیں دینے سے پیچھے نہیں ہٹا اور نہ ہٹوں گا۔ ملک کی حالت خراب سے خراب تر ہی کیوں نہ ہو جائے یا بغاوتیں کیوں نہ ہوں میں نے مختلف تاریخیں پڑھی ہیں اور ان سے یہ معلوم ہوا ہوگا کہ بادشاہوں

Marfat.com

نے ایسے حالات میں کیا سزائیں نہیں دیں"۔ ضیاء الدین برنی نے ادب سے جواب دیا کہ "میں نے شاہی تاریخوں کا مطالعہ کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ سزا کے بغیر اپنی حکومت نہیں چلا سکتا اور اگر وہ اس قسم کی سزائیں نہ دے تو خدا ہی جانے کہ بدظن لوگوں کی جانب سے کتنی مصیبتیں آئیں اور ہزاروں جرم رعایا کی جانب سے سرزد ہوں۔ جمشید سے دریافت کیا گیا تھا کہ سزائیں کن حالتوں میں واجب ہیں۔ اس نے جواب میں کہا کہ سات حالتوں میں مثلاً ترکِ مذہب، ارادۂ قتل، شادی شدہ عورت سے زناکاری، بادشاہ کے خلاف سازش، باغیوں کی امداد یا بغاوت کرنا، دشمنوں یا بادشاہ کے دشمنوں سے ملنا، قانون یا مملکت کی خلاف ورزی۔ ان وجوہ کے علاوہ کوئی انسان ملک میں گڑبڑ پیدا کرے یا تکلیف دے یا ملک کو نقصان پہنچائے یا سازشیں کرے وہ بھی سزا کا مرتکب ہوتا ہے۔ جو بادشاہ کے قانون یا حاکم کو نہیں مانتا وہ خدا کے حکم کو بھی نہیں مانتا کیونکہ بادشاہ خدا کا نائب ہے۔ اگر بادشاہ سزائیں نہ دے تو حکومت میں نراج پیدا ہو جائے گا۔ محمد تغلق کو ضیاء الدین برنی کا جواب سن کر اطمینان نہ ہوا کیونکہ جو کچھ بھی برنی نے کہا وہ اس نے اپنے آقا کے خیال کی تصدیق کی تھی۔ اس نے ضیاء الدین برنی سے پھر دریافت کیا کہ اس کا رویہ کیا شریعت کے موجب ہے[1]

1۔ محمد تغلق کے اس سوال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اپنا راج شریعت پر قائم نہیں کیا تھا۔

برنی نے ادب سے جواب دیا کہ شریعت کی رو سے سرکشوں کی قسمیں صرف تین ہیں (۱) ترک مذہب (۲) مسلمان کا قتل (۳) شادی شدہ عورت سے زناکاری۔ باقی سزائیں جو دی جاتی ہیں وہ شریعت کے تحت نہیں آتیں بلکہ راج نیتی اور اچھی حکومت کے اصول کہے جاتے ہیں۔ وزیروں کا ذکر کرتے ہوئے ضیاء الدین برنی نے جمشید کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ایسے حالات میں بادشاہ وزیروں کا تقرر کرتا ہے اور ان کو اعلیٰ اعزاز دے کر حکومت کے انتظامات بھی سونپ دیتا ہے تاکہ وہ ملک کو بہتر طریقے سے چلا سکیں۔ اس طرح ایک بادشاہ اپنے کو اس خونی الزام سے بچا لیتا ہے جو اس پر عائد ہوتا ہے۔ محمد تغلق کو یہ نصیحت کچھ پسند نہ آئی کہ وہ اپنا راج پاٹ وزیروں کے ہاتھ میں دے اور اس نے جواب دیتے ہوئے یہ کہا کہ جو بھی جمشید کے احکام تھے ان کا تعلق ایک پرانے زمانے سے تھا لیکن اس زمانے میں بدمعاشوں اور فسادیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ میں ان کو یہ سمجھ کر سزائیں دیتا ہوں کہ وہ باغیانہ اور مفسدانہ حرکت سے باز آئیں لیکن وہ نہیں مانتے۔ اس وجہ سے ان میں اکثر موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے ہیں۔ میں اس وقت تک ایسا ہی کرتا رہوں گا جب تک کہ میری جان میں جان ہے۔ اس لئے لوگ سچ مچ اپنے رویے کو بدل دیں اور بغاوت اور سازش کرنا چھوڑ دیں۔ میرے یہاں ایسے وزیر نہیں جو ایسے قاعدے بنائیں تاکہ خونریزی کم ہو سکے۔ میں لوگوں کو سزائیں دیتا

Marfat.com

ہوں کیونکہ وہ سب کے سب میرے مخالف اور دشمن ہو گئے ہیں۔
میں نے بے انتہا دولت ان کو دی لیکن وہ میرے دوست نہ بن
سکے اور نہ میرے وفادار۔ میں ان کی طبیعت سے خوب واقف ہوں
اور دیکھ رہا ہوں کہ وہ مجھ سے بدظن ہیں اور مجھ سے دشمنی برتتے ہیں میری
حکومت کی حالت ایک مریض کی ہے جس پر کوئی دوا اثر نہیں کرتی
اور کوئی علاج اس کو تندرست نہیں کر سکتا۔ طبیب اگر درد سر کا
علاج کرتا ہے اور شفا پہنچاتا ہے تو بخار پیدا ہو جاتا ہے اور اگر بخار
کو دور کرتا ہے تو کوئی دوسری بیماری کھڑی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح
میری حکومت میں بدامنی پھوٹ رہی ہے۔ میں ایک جگہ سے اس
کو دباتا ہوں تو وہ دوسری جگہ سے نکل پڑتی ہے۔ ضیاء الدین برنی
نے بادشاہ کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا کہ جب بعض بادشاہ ایسا
محسوس کرتے ہیں کہ وہ اپنی رعایا میں اعتماد نہیں پیدا کر سکتے اور عام
نفرت کا مرکز بن جاتے ہیں تو ان کو چاہیئے کہ تخت چھوڑ دیں اور
اپنے لڑکوں میں سے کسی ایک اہل ترین لڑکے کو گدی پہ بٹھا کر خود
گوشہ نشینی اختیار کریں اور اپنے نیک کاموں میں لگ جائیں جس سے
ان کی زندگی کے آخری دن سرکاری کام کی دیکھ بھال کی ذمہ داریوں
سے آزاد ہو کر چین سے کٹ سکیں۔ بعض بادشاہوں نے ایسے
حالات میں یہ کیا کہ شکار کھیلنا، عشرت پسندی اور شراب نوشی کو
اپنی زندگی کا شیوہ بنا لیا اور حکومت کے تمام معاملات وزیروں اور

Marfat.com

افسروں کو سونپ دیئے۔ اس طرح سے رعایا میں خوشنودی کے جذبہ کا اظہار پھر سے ہوتا ہے۔ بادشاہ کا غضب دور ہو جاتا ہے اور ریاست تمام بیماریوں سے آزاد ہو جاتی ہے۔ تمام سیاسی بیماریوں میں سے سب بڑی اور ہولناک بیماری جنتا کا عام جذبۂ نفرت اور عدم اعتماد ہے۔ محمد تغلق نے ضیاء الدین برنی کی بات چیت سن کر اشترتہ نفرت دیا لیکن اس کے لئے تخت چھوڑنا ناممکن تھا۔ صرف ایک ہی صورت میں وہ ایسا کرنے کیلئے تیار تھا۔ وہ کہتا ہے کہ راج پاٹ کے معاملے اس کی مرضی اور خواہش کے مطابق اسی وقت طے پا سکتے ہیں جب کہ اس کی ریاست تین شخصوں کے سپرد کی جائے۔

(۱) فیروز شاہ (۲) ملک کبیر (۳) احمد ایاز۔ وہ اپنی رعایا سے بہت خفا ہے اور وہ بھی اس سے رنجیدہ ہے۔ رعایا اس کی طبیعت اور مزاج سے واقف ہے اور وہ اس کی مصیبت اور تکلیف سے۔ وہ جو علاج اس کی بھلائی کے لئے کرتا ہے اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس کا علاج باغیوں، دشمنوں، مفسدوں اور بدطینتوں کے لئے تلوار ہے۔ وہ تلوار سے کام لیتا ہے اور سزائیں بھی دیتا ہے تاکہ مصیبت اٹھا کر لوگ اچھے راستہ پر لگ سکیں۔ رعایا جتنی مخالفت کرتی جائے گی اتنی ہی وہ سزائیں دیتا رہے گا۔ محمد تغلق نے آخر دم تک اپنے رویہ میں تبدیلی نہیں کی کیونکہ رعایا کی طبیعت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس نے رعایا کے لڑائی کے دعوی کو قبول

کیا اور ایک حاکم کی حیثیت سے لڑا۔ اس کا عہد دراصل شاہی کے منصوبوں اور سیاسی طاقتوں کے مکر کی ایک نظیر تھی۔ وہ زمانہ کی جہالت کا شکار رہا۔

محمد تغلق کے انتقال کے بعد حکومت کے سامنے یہ سوال تھا کہ اس کا جانشین کون ہے کیونکہ اس کا کوئی لڑکا نہ تھا جو گدی پر بیٹھتا ملک کو سیاسی نزاع سے بچانے کی خاطر اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کسی ایک اہل ترین شخص کا انتخاب کیا جائے جو شاہ کے فرائض انجام دے سکے۔ امراء اور سرکاری اعلیٰ افسروں کے غور وفکر کے بعد یہ تصفیہ ہوا کہ فیروز شاہ تغلق کا چناؤ کیا جائے جو اس کے بھائی کا لڑکا تھا۔ فیروز شاہ کے چناؤ میں ہر دلعزیزی کا عنصر غالب تھا۔ اس چناؤ میں علماء کے طبقہ کا بھی بہت بڑا دخل تھا گو فیروز شاہ تخت پر نہیں بیٹھنا چاہتا تھا۔

Marfat.com

نواں باب

فیروز شاہی دور

فیروز شاہ کی سیاسی تربیت غیاث الدین تغلق اور محمد تغلق کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ محمد تغلق نے خصوصاً یہ سمجھ کر کہ فیروز شاہ اس کا جانشین بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اس کو عملی راج پاٹ میں سبق دیئے تھے فیروز شاہ تغلق محمد تغلق کو اپنا آقا، اپنا استاد اور اپنا رہنما مانتا تھا۔ گو وہ تغلقی اسکول میں پلا تھا لیکن اس کی خود ایک وحدت تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دونوں راجوں کی خوبی اور برائی دیکھی تھی اور وہ اپنی تجربہ کاری کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا کہ راج کو کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ اس میں اس بات کا بھی احساس پیدا ہوا کہ تلوار کی طاقت راج کے عام معاملوں کے لئے مفید نہیں ہے اور اس کی بجائے انسانی نظریہ اور طاقت بے حد ضروری ہے۔

فیروز شاہ کے ابتدائی زمانہ میں بہت سی مشکلیں آئیں۔ سب سے پہلی دشواری سیاسی مخالفت تھی۔ اس نے اس کو حکمت عملی، تجربہ کاری

اور دانشمندی سے دور رکھا۔ فیروز شاہ ایک انسان پرور حاکم تھا جس کا مسلک انسانی اصولوں کو ترقی دے کر راج کی بنیاد تہذیبی اصولوں پر رکھنا تھا۔ نئے ملکوں کی فتح کی خواہش اور تمنا اس کے دل میں نہ تھی۔ سیاسی فتح کی بجائے اخلاقی فتح اس کا منصوبہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے جہانگیری کی بجائے جہانبانی کے اصولوں کو اپنے سامنے رکھا۔ گو تاریخ کے لکھنے والے یہ بتاتے ہیں کہ فیروز شاہ کی پالیسی اس کی طبیعت کی کمزوری کا نتیجہ تھی لیکن اس خیال میں اصلیت نہیں ہے کیونکہ اس کی راج نیتی کا اصول مذہبی بنیاد پر تھا۔ وہ اپنے زمانہ کے ذہنی اور اخلاقی رجحانوں سے مختلف تھا۔ اس کی نظر میں حکومت کرنے کے معنی یہ نہ تھے کہ ملکوں پر چڑھائی کی جائے اور ان پر قبضہ کیا جائے حکومت جبر اور زیادتی کا نام نہیں ہے۔ حکومت کو اعلیٰ اصولوں پر کاربند ہونا چاہیئے۔ لڑائی کے بجائے امن حکومت کی جان ہے۔ اس لحاظ سے فیروز شاہ ایک امن پسند حاکم تھا اور اسی وجہ سے اس نے اپنے زمانہ کے رواجی، سیاسی اصولوں اور دستوروں کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

فیروز شاہ نے اپنی شاہی کو مذہبیت میں رنگا۔ گو وہ محمد تغلق کے سیاسی فلسفہ کا ایک زندہ نمونہ تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کا مخالف بھی تھا۔ دراصل اس نے ان چیزوں کو جڑ سے اکھیڑ دیا۔ فیروز شاہ نے ایک خاص طرز کی راج نیتی کی داغ بیل ڈالی۔ یہ راج نیتی مذہبی راج نیتی تھی جس کا اثر شاہی پر، راج پر اور سیاست پر کیاں

پڑا۔ اس نئے فیروز شاہی اصول کو ہم اسلامی اصول سے تعبیر کر سکتے ہیں جس کی بنیاد اسلامی اور تہذیبی تھی۔ اسلامی قدروں کی ترقی اور تہذیبی اصولوں کا پرچار فیروز شاہ کی شاہی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ اس اعتبار سے راج نیتی اور راج کاری اسلامی رنگ میں رنگی گئی اور اس کی بنیاد تہذیبی قوتوں پر رکھی گئی۔ دوسرے لفظوں میں فیروز شاہی ایک طرف اپنے کو اسلامی اصول کی حد بندی میں جکڑ رہی تھی تو دوسری طرف اپنی تربیت تہذیبی قوتوں کے ذریعہ کر رہی تھی۔

فیروز نے شاہی میں ایک مسلک چمکتا ہوا دیکھا۔ اس کا ایک مشن تھا اور وہ مشن دنیا دارانہ شاہی سے بالکل مختلف تھا۔ خدا کی حکومت کو زمین پر قائم کرنا اس کا شیوہ تھا اور اس جذبہ کے تحت اس نے اپنی شاہی کی تربیت کی اور راج میں جو جو نیا پن دکھائی دیا وہ اسی اصول کا نمونہ تھا۔ فیروز شاہ نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ اللہ کی مرضی کے مطابق حکومت کرے۔ اس وجہ سے فیروز شاہ کے زمانہ میں شاہی کا نیا ڈھنگ اور طرز نظر آنے لگا جو پچھلے زمانوں کی شاہیوں سے بالکل مختلف تھا۔ عام طور سے وہ بے روک ٹوک سیاسی قانون کی پابند تھیں اور اکثر تلوار کا قانون ہی میں کام کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا، گو اس قانون سے حکومت کی جڑیں مضبوط نہ ہو سکیں۔ فیروز شاہ سے پہلے ہمیں اس بات کا ثبوت تاریخ میں کہیں نہیں ملتا ہے کہ تلوار کا قانون اور انسانی اصولوں کے مابین جد و جہد رہی۔ فیروز شاہ نے

Marfat.com

اس بے روک تلوار کے قانون کی جہان بین اسلامی کسوٹی پہ کی اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس میں کوئی اصلیت نہیں ہے۔ تلوار کے ذریعہ حکومت کرنا، انسانی ہمدردی اور رواداری کو دور کرنا، وحشی جذبہ کو فروغ دینا۔ ظلم اور تشدد کا بڑھنا ہے، سدھار کی قوت کو گھٹانا ہے اور اپنے مقصد کے حصول میں ناکام ہونا ہے۔ نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ انسانوں کے زوال کے ساتھ ساتھ انکی بربادی اور بے حرمتی ہوتی ہے۔ یہی ہے انصافی کے اصول تھے جن میں فیروز شاہ کو یقین نہ تھا اور اس کے خلاف اس کا ردعمل ایک نئی امن پسند، انصاف پسند شاہی کو قائم کرنے میں رونما ہوا گو وہ شاہی اسلامی نظریوں سے بھرپور تھی۔

ہندوستان میں ایک ایسی ہی نظیر ہمیں پرانے زمانے میں ایک بُرے حاکم کی شخصیت میں ملتی ہے۔ وہ شخصیت اشوک کی تھی جس نے ظلم، تشدد اور قانونِ تلوار کے خلاف یعنی سماج نیناک اصولوں کے خلاف آواز بلند کی اور جو اپنی حکومت کی بنیاد انسانی اصولوں پہ رکھ کر اپنے کو امر کر گیا۔ جس طرح اشوک نے ایک نئے سماجی اور راج نیتی نظام کی نیو اخلاقی بنیادوں پہ رکھ کر راج کیا ویسے ہی فیروز شاہ نے حکمرانی کے اصولوں میں بھی تبدیلی پیدا کی تاکہ ملک میں امن بہتر طریقہ سے قائم ہو سکے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ محمد تغلق کے دور کے نراج کا توڑ فیروز شاہی اصول ہی میں کارگر ہو سکتا تھا۔ رعایا کی بے چینی، ملک کی عام فسادی حالت اور بے اعتنائی دراصل نئے جذبات اور نئے نقطۂ نظر سے

ہی ممکن تھی تاکہ انسان کی بھلائی کی حفاظت اور انسان کی پرورش ہو سکے۔ اس لحاظ سے فیروز شاہ کا راج وہ راج تھا جس میں انسانی قوتیں، رحم، نرمی اور مہربانی فروغ پا سکیں۔ حالات کی تبدیلی اس وقت تک ممکن نہ تھی جب تک کہ بے ضابطگی کا دباؤ اور بے قاعدگی کی بندش نہ ٹوٹ سکے۔ اسی وجہ سے فیروز شاہ کی شاہی نے ایک نئی راہ اختیار کی اور اپنے راج میں جبر کے قانون کو انسانی قانون میں بدلا۔ فیروز شاہ کے اس نظریہ اور عمل کا یہ نتیجہ نکلا کہ لوگ اس کو اپنا محافظ سمجھنے لگے۔ گو فیروز شاہ کی حکومت اسلامی اصولوں سے لبریز تھی لیکن عوام کی بھلائی اور بہبودی اس کا سب سے بڑا فرض تھا۔ اس اصول کے تحت اس نے تمام بے جا قوانین جن کے تحت رعایا مر رہی تھی ختم کئے۔ تمام وہ چیزیں جو شریعت کے خلاف کسی بھی شعبۂ زندگی میں حکومت کو نظر آتی تھیں دور کیں۔ اس تمام اسلامی تحریک میں جس جذبہ نے فیروز شاہ کی شاہی کو زندہ کیا وہ فلاح و بہبود کا اصول تھا۔

حکمرانی اور انتظامی نقطۂ نظر سے حکومت کو بہت سے مالی نقصانات اٹھانے پڑے کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے ملک میں بہت سے غیر شرعی ٹیکس لئے جاتے تھے جس کو فیروز شاہ نے یک لخت منسوخ کیا صرف وہی ٹیکس بحال رکھے گئے جو شریعت کے مطابق تھے۔ اس طرح فیروز شاہ کی حکومت کی جائز آمدنی کے ذرائع صرف چار تھے

کئے گئے تھے یعنی خراج، جزیہ، زکواۃ اور خمس۔

اس ضمن میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان چار آمدنی کے ذریعوں کی نوعیتوں کی وضاحت کریں کیونکہ ان کے متعلق ہماری تاریخوں میں بہت سی غلط فہمیاں اب تک چلی آرہی ہیں۔ خراج دراصل ایک محصول تھا جو قابل کاشت زمین کے مالک سے خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلمان حکومت لیتی تھی۔ محصول کی شرح ۱/۱۰ حصہ زمین کی پیداوار کا ہوتا تھا۔ زکواۃ صرف مسلمان طبقہ سے لی جاتی تھی۔ اس کی آمدنی بیت المال کے لئے وقف ہوتی تھی۔ جزیہ کے متعلق بے حد غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے مفہوم کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم جزیہ کے معنی سمجھیں۔ جزیہ کا لفظ گزیدہ سے نکلا ہے۔ گزیدہ دراصل ایک اعتبار سے ایک پول ٹیکس (باربرداری) تھا، یہاں تک کہ ایرانیوں نے بھی میسوپوٹیمیا کی فتح کے بعد اس ٹیکس کو اصلی روپ میں رکھا۔ فارسی کی قدیم کتابوں میں بھی لفظ گزیدہ آتا ہے۔ فردوسی شاہنامہ میں بھی اس لفظ کو استعمال کرتا ہے۔ ابن عصیر نے لکھا ہے کہ ایران کے بادشاہ نوشیرواں نے اپنے ملک کی زمینوں کی پیمائش کروائی اور ہر ایک پر جزیہ عائد کیا سوائے فوجی اور سرکاری افسران کے۔

اسلام کی تاریخ میں جزیہ نے ایک اہمیت حاصل کی تھی، گو قرآن میں جزیہ کے متعلق صرف ایک ہی آیت ملتی ہے (سورۃ ۹، آیت ۲۹)

اسلامی عمل کے اعتبار سے جزیہ نے دو خصوصی حالتیں اختیار کی ہیں
ابتداءً جزیہ کے معنی دراصل مجموعی خراج جو مفتوح علاقوں پہ عائد کیا
جاتا تھا، سمجھا جاتا ہے۔ عربوں نے اسلام کے ابتدائی زمانہ میں یہ رویہ
اختیار کیا تھا کہ جب وہ ملک فتح کرتے تو ملک کا انتظام ملک والوں
کے ہاتھ رکھتے تھے اور ان سے جو مال گذاری وصول ہوتی تھی وہ جزیہ تصور
کیا جاتا تھا۔ یہی ایک اصلیت ہے جہاں ابتدائی اسلامی تاریخ میں
جزیہ اور خراج میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا تھا، یہاں تک کہ خراج
بحیثیت جزیہ کے اور جزیہ بحیثیت مالگذاری کے یہ ایسی اصطلاحیں
تھیں جو ہم معنی تصور کی گئی ہیں۔ جرمن کا مشہور اسلامی تاریخ کا مورخ
یہ لکھتا ہے کہ جزیہ اور خراج ابتداءً مساوی اعتبار سے سمجھے ہی نہیں
گئے بلکہ مفتوح علاقوں سے جو خراج وصول کیا گیا وہ یا تو زمین سے
جزیہ تھا یا انسان سے خراج۔

حضرت عمر خلیفہ دوم کی خلافت کے دوران میں اس بات کا
تصفیہ کیا گیا کہ خراج اور جزیہ میں ایک نمایاں فرق ہے، اور یہ تصفیہ
ہوا کہ جزیہ انسان پر عائد ہوتا ہے اور اس کا اطلاق غیر مسلم پر ہوتا ہے
برعکس اس کے خراج زمین سے لیا جاتا ہے اور انسان کی ذہنیت اس سے
نہیں ہوتی۔ خراج اس مسلمان سے بھی لیا جاتا ہے جس کے پاس
زمین ہو۔

اس طرح واضح ہوا کہ جزیہ ابتداء سے ایک پول ٹیکس نہ تھا

اٹلی کا مشہور اور ذہین سیٹ کیٹانی اپنی کتاب "اناٹی دی اسلام" میں لکھتا ہے کہ جزیہ کی تشریح بحیثیت ایک انسانی ٹیکس کے درحقیقت ایک جدت ہے جو بعد کے قاضیوں کے ہاتھوں پیدا کی گئی اور جو دراصل اسلام کے ابتدائی زمانہ کے اصلی حالات سے بالکل ناواقف تھے مصری شہادت سنہ ہجری تا سنہ ۹ ہجری کی بنا پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ محض فوج کی تنخواہوں کی ادائی کرنے کے لئے مختص تھا۔ اس لحاظ سے جزیہ دراصل ایک محافظتی رقم تھی جو اسلامی مملکت غیر مسلمانوں سے وصول کرتی تھی تاکہ ان کی حفاظت بحیثیت ذمی سماجی، معاشی، مذہبی اور سیاسی حقوق کی پامالی کے بغیر کر سکے۔ دوسرے لفظوں میں ذمیت کا مرتبہ ذمیوں کو حسب ذیل حقوق دیتا ہے۔

(۱) ایذا سے محفوظ رکھنا۔ (۲) حفاظت

پہلے حق سے وہ "امین" تصور کئے جاتے ہیں اور دوسرے سے وہ "محروس" خیال کئے جاتے ہیں۔

ذمیت کی حیثیت میں ذمی کو حق ہے کہ وہ سرکاری ملازمتیں کر سکے اور اس کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنے سماجی اور مذہبی رسم و رواج اور تیوہار منا سکیں۔ ان کے مندروں کی حفاظت اسلام کا قانون کرتا ہے۔ اس طرح اسلامی حکومت ذمیوں کی حفاظت اور ان کے تحفظ کا ذمہ لیتی ہے۔ لشکر اسلام پر یہ مذہبی فرض عائد ہے کہ وہ لڑائی اور مصیبت کے وقت ذمیوں کو بچائے اور ان کی

Marfat.com

حفاظت کرے۔ دراصل جزیہ زرِ ذمیان بحیثیت محافظتی رقم کے سمجھا جاتا ہے اور جس سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کے خون کی قربانی ذمیوں کی راہ میں وقت اور موقع پر لازم ہے۔ اگر اسلامی حکومت اس ذمہ دارانہ فرض کو ادا نہ کر سکے تو جزیہ لینے کی حقدار نہیں ہے۔ اسلامی ملکوں کی تاریخی شہادتیں یہ پتہ دیتی ہیں کہ جزیہ اسلامی حکومت نے اس وقت واپس کر دیا جب کہ وہ ذمیوں کی حفاظت کرنے سے قاصر رہی۔ اسلامی قانون کی روسے ذمی فوجوں میں شریک ہو سکتے ہیں، گو وہ مجبور نہیں کئے جا سکتے کہ وہ فوج میں شریک ہوں، کیونکہ جس مرتبہ پہ وہ مامور ہیں وہ ذمیت کا مرتبہ ہے۔ اگر وہ اپنی مرضی اور خوشی سے فوج میں شریک ہوتے ہیں تو ان سے جزیہ نہیں لیا جا سکتا۔

جزیہ صرف اس نوجوان مردِ ذمی پہ عائد ہوتا ہے جس کے جسمانی اور ذہنی قویٰ شگفتہ ہوں اور جس کے پاس رقم ادا کرنے کا ذریعہ ہے۔ جزیہ ایک قانون کا پابند تھا یعنی جب ہتھیاری قوت کی بنا پر ملک فتح کیا جاتا تھا تو اس وقت یا تو عہد و پیمان ہوتا تھا یا امامِ وقت کو یقین دلایا جاتا تھا کہ ذمی ہر حالت میں اسلامی حکومت کو سالانہ رقم جزیہ دینے کا وعدہ کرے گا۔ سالانہ رقم کی شرح حسب ذیل ہے:۔

(۱) ۴۸ درم امیر سے وصول کئے جاتے تھے

(۲) ۲۴ درم اوسط جماعت کے لوگوں سے

(۳) ۱۲ درم غریب طبقہ سے

Marfat.com

بچے، عورتیں، معذور، ضعیف، بوڑھے، وہ انسان جس پر کسی قسم کی قانونی ذمہ داری نہ ہو، بھیکاری، اندھے، لولے، پروہت (پروہت سے مُراد اس طبقہ سے ہے جس نے کنارہ کشی اختیار کر لی ہو) جزیہ نہیں دیتے تھے۔ اگر لنگڑے، لولے اور پروہت مالدار ہیں تو ان سے جزیہ لیا جا سکتا تھا۔ غلام مستثنیٰ تھے۔ جزیہ یا تو روپے پیسے میں یا جنس کی شکل میں لیا جاتا تھا۔ اسلامی قانون کی توڑ مروڑ جہاں تک جزیہ کے معنی اور اس کے اطلاق کا تعلق تھا فقہاء نے سیاسی حالات کے تحت کی تاکہ اسلامی حکومت کے سیاسی مفاد کو مضبوط تر کیا جائے اور مفتوح کو جہاں تک ہو سکے بے زبان رکھ کر حکومت کرے۔ محققین کا یہ کہنا ہے کہ ان فقہاء نے لفظ جزیہ سے بے جا فائدہ اٹھایا۔ اسلامی دنیا کے مشہور عالم الغزالی نے قرآن کی آیت (۹-۲۹) پر جو مختلف مفسرین نے تفسیریں کی ہیں تبصرہ کیا اور اعتراض کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ وہ جاہلانہ غلط فہمیاں ہیں۔ ابن قاسم کے اعتبار سے قرآن کے الفاظ "وَہُمْ صَاغِرُوْنَ" کے معنی یہ بھی نہیں لئے جا سکتے کہ ذمیوں کی سیاسی، معاشی، مذہبی اور اخلاقی پستی ہو۔ اس قسم کی توہین کی اجازت اسلام کے قانون میں نہیں ہے۔ عملی اعتبار سے جو کچھ بھی ہوا اس کی ذمہ داری فقہاء پر عائد ہوتی ہے۔

ہندوستان کے وسطی عہد میں ہندوؤں کو مسلمانوں کی طرح حکومت کی ملازمتیں ہی نہیں ملیں بلکہ فوجوں میں بھی بھرتی کئے جاتے تھے۔ فیروز شاہ

Marfat.com

سے قبل اس بات کو ثابت کرنا بے حد دشوار ہے کہ ہندو رعایا پر جزیہ عائد کیا گیا تھا یا نہیں۔ لفظ "جزیہ" کا استعمال اس عہد کی تاریخی کتابوں میں بہت کم ملتا ہے۔ اگر جزیہ رائج تھا تو وہ اسلام کے قانون کے بموجب نہ تھا کیونکہ ہمیں کہیں بھی اس قسم کی شہادت نہیں ملتی کہ حکومت کلیتہً یا پورے طور سے اسلامی رنگ میں رنگی جا چکی تھی۔ فتوحات فیروز شاہی سے اس بات کا صاف پتہ چلتا ہے کہ پہلے بادشاہوں نے ہندوستان میں اسلامی اصولوں اور احکام کی کوئی پرواہ نہ کی اور نہ ان پر چلنے کی کوشش کی کہ آیا وہ حکومت اسلام کے قانون کے پابند ہیں یا نہیں۔ اس بات کا خیال کئے بغیر ملک پر حکومت کی۔ بادشاہ مسلمان ضرور تھے لیکن ان کی حکومت، نظریہ اور عمل کے اعتبار سے اسلامی نہ تھی۔ وہ اداروں کا مجموعہ تھی جن کے ذریعہ سے سیاسی کاروبار چلتا تھا لیکن یہ کہنا کہ وہ سو فیصدی اسلامی تھی صحیح نہیں ہے۔ چند مسلمان بادشاہوں کی یہ خواہش رہی کہ وہ حکومت کو اسلامی ڈھنگ پر چلائیں لیکن ان کو اس وجہ سے کامیابی حاصل نہ ہوئی کہ وہ خود اسلامی سیاسی مسلک اور عمل سے بہت دور ہی نہ تھے بلکہ ناآشنا بھی تھے۔ وہ دراصل سیاسی قوتوں کی پیداوار تھے۔ ہندوستان کے سیاسی حالات سے ان کو دوچار ہونا پڑا تھا اور ان ہی سے متاثر ہوئے تھے۔

عہد وسطیٰ میں فیروز شاہ ہی پہلا بادشاہ گزرا ہے جس نے شاہی حکومت کو اسلامی حکومت میں رنگنے کی کوشش کی کیونکہ اس کا مسلک

Marfat.com

اسلامی تھا۔ اس کے رائج میں جزیہ بحیثیت ایک اسلامی قانون کے رائج تھا۔ تاریخ فیروز شاہی یہ بتاتی ہے کہ ہندوؤں اور مورت پرستوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ وہ ذمیت کے مرتبے قبول کریں اور ذمیان دیں اور حکومت اپنے ذمہ تمام ذمہ داریاں لے اور حکومت اپنے ذمہ ذمیوں کی حفاظت لے تاکہ وہ بلا روک ٹوک کے اپنے مذہبی عقائد اور اپنے رسم و رواج کے پابند رہ سکیں۔ شمس سراج عفیف اپنی کتاب تاریخ فیروز شاہی میں جزیہ کی شرح جو فیروز شاہ کے زمانہ میں رائج تھی یوں لکھتا ہے۔

(۱) ۴۰ تنکہ ، (۲) ۲۰ تنکہ ، (۳) ۱۰ تنکہ

آخر میں چل کر یہ شرح (۱۰) تنکہ اور (۵۰) جدل ہو گئی۔

خمس کے متعلق اسلامی قانون یہ ہے کہ جو مال غنیمت لڑائی کے زمانہ میں مفتوح علاقوں سے "لشکر اسلام" حاصل کرتا ہے اس کا $\frac{1}{5}$ واں حصہ حکومت کو لینا چاہیئے اور رہے واں حصہ فوج میں تقسیم ہونا چاہیئے۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے اس اسلامی حکم کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا اور شاید ایسا عمل مسلمان بادشاہوں نے بھی اپنے دورِ حکومت میں بھی اختیار نہ کیا ہو۔ فیروز شاہ تغلق نے اس اصول کو رواج دیتے ہوئے اپنی کتاب "فتوحاتِ فیروز شاہی" میں یہ لکھا ہے کہ اس قانون پر عمل نہیں کیا گیا اور اس کو بالکل نظر انداز کیا گیا اور آئندہ سے مالِ غنیمت کا $\frac{1}{5}$ حصہ صرف حکومت لے گی۔

Marfat.com

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ فیروز شاہ کی شاہی محافظتی تھی۔ اس کو رعایا کی بھلائی کا بے حد خیال تھا۔ رعایا کی داد دہی اور بہبودی اور خیال کا اظہار کہیں بھی اس نمایاں طور سے نہیں ہو سکا جیسا کہ اس نے ایک فرمان کے ذریعہ دو کروڑ تنکوں کا بقایا جو رعایا کی جانب سے وصول طلب تھا منسوخ کیا۔ یہ وہ رقم تھی جو محمد تغلق کے زمانہ میں حکومت کی جانب سے رعایا کو دی گئی تھی تاکہ وہ اپنی زمینیں، مکانات اور دیہات جو قحط کے زمانہ میں خراب اور تباہ ہو گئے تھے درست کر لیں۔ فیروز شاہ نے اپنے وزیروں سے اس مسئلہ پر بحث کی اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر یہ قرضہ رعایا سے وصول کیا جائے تو اس سے ان کی حالت اور زیادہ بد سے بدتر ہو جائے گی کیونکہ ان میں اتنی سکت باقی نہیں کہ وہ اس قرضہ کو واپس کر سکے۔ خدشہ اس بات کا تھا کہ کہیں بیماری اور زیادہ نہ بڑھ جائے اور لوگوں میں بدامنی کے عناصر پھوٹ پڑیں اس خیال کے تحت فیروز شاہ نے اعلان کیا کہ تمام وہ سرکاری دستاویزیں جن میں رعایا کے قرض درج ہیں پبلک کے سامنے منسوخ کر دی جائیں عوام کے معاملات میں یکسوئی پیدا کرنے کا یہ ایک نرالا مگر انسانی طرز عمل تھا جو فیروز شاہ کی شاہی کی جدت پسندی کو واضح طور سے دکھاتا ہے تاکہ رعایا خوش و خرم رہے اور اطمینان کی نیند سو سکے۔ اس شاہی عمل سے رعایا کو سکون ہو گیا اور وہ احسان اور ممنونیت میں ڈوب گئی۔

Marfat.com

اس طرح فیروز شاہ کی سخاوت اور اس کے انسانی پن کا اظہار زمین اور اس کے لگان کے مسئلہ سے ہوتا ہے۔ لگان کا مسئلہ ہمیشہ سے ایک الجھن اور گتھی بنا رہا ہے کیونکہ ہندوستان کا اصل مسئلہ زمین اور اس کا لگان ہے جو اس مسئلہ کو حل کرے گا وہی ہندوستان کی بھلائی کرے گا۔ فیروز شاہ نے اس مسئلہ کو ایک گہری ہمدردانہ اور راج نیتک نظر سے دیکھا کیونکہ رعیت حکومت کی ریڑھ کی ہڈی تصور کی جاتی ہے اس غور و فکر کا نتیجہ یہ نکلا کہ فیروز شاہ نے وہ غیر دانشمندانہ ضابطے اور اصول جو پچھلے زمانہ سے چلے آ رہے تھے اور جن کی وجہ سے رعیت کو مصیبت اور دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا یک لخت ختم کر دیے شرح جو معین کی گئی وہ زمین کی پیداوار کی مناسبت کا لحاظ کرتے ہوئے اور رعیت کی ادا کرنے کی صلاحیت کا خیال رکھتے ہوئے کی گئی کیونکہ جو اصول پیش نظر تھا وہ یہ کہ ایسا محصول حکومت نہ لے جس کی ادائی رعایا کی قوت سے باہر ہو۔ اس طرح فیروز شاہی عہد میں ہر بے جا اور ناواجب محصول اور ٹیکس منسوخ کیے گئے۔ وہ عمل کہ "ایک گائے چھوڑ دو باقی سب لے لو" فیروز شاہ نے ناجائز قرار دیا۔ اسی سلسلہ میں نئے قانون عمل میں لائے گئے تاکہ پیداوار وسیع تر ہو سکے اور رعایا کی خوشحالی بڑھ سکے۔ رعایا کے مفاد کے تحت یہ لازم گردانا گیا کہ مقررہ سرکاری محصول سے زائد لینا قاعدہ کے خلاف تھا۔ فیروز شاہ کی شاہی اس طرح انصاف اور برابری کے اصول کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہوئی۔ کسی شخص کو یہ اختیار حاصل

نہیں تھا کہ وہ ظلم اور تشدد کر سکے اور نہ دقت اور دشواری دوسروں کی راہ میں پیدا کر سکے۔ تمام ملک میں امن اور حفاظت کے ساتھ انسان زندگی بسر کرنے لگے۔

گو فیروز شاہ ایک پُرامن بادشاہ تھا جس کو رعایا کے دکھ درد کا خیال رہتا تھا۔ لیکن مذہبی دُنیا میں اس کے خیالات اور جذبات قدامت پسند تھے۔ وہ محمد تغلق جیسا وسیع النظر نہ تھا اور نہ رواداری کی اسپرٹ اس میں تھی۔ وہ ایک مذہبی انسان تھا جو اسلام کے قدامت پسند اسکول کا حامل تھا۔ اسلام میں "آزاد خیالی" اور "آزادی کا تصور" اس کے پاس نہ تھا۔ غالباً فیروز شاہ کے مذہبی ایمان کی تشکیل میں علماء کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہو، کیونکہ اس کے دورِ حکومت میں علماء کو نہ صرف عزت اور مرتبہ حاصل ہوا بلکہ تمام امورِ حکمرانی میں دخل کافی سے زیادہ تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ علماء کا طبقہ فیروز شاہی حکومت پر غالب تھا تو مبالغہ نہ ہوگا۔ محمد تغلق نے علماء کو ان کے درجہ سے گرایا ہی نہ تھا بلکہ ان پر کڑی نگرانی رکھ کر ان کی بندش کی تھی۔ ان کی سیاسی قوت کو توڑا اور ان کے مذہبی اثر کی روک تھام کی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علماء ایک سماجی اور مذہبی جماعت کی حیثیت سے بے لگام نہ ہو سکے۔ محمد تغلق کے زمانہ میں ہمیں اس بات کی بھی شہادت ملتی ہے کہ اس زمانہ کی مذہبی دنیا میں مختلف قسموں کی آزاد پسند تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں اور جن کا اثر عام لوگوں پر نمایاں ہو رہا تھا لیکن بادشاہ کی جانب سے

Marfat.com

کسی بھی فرقہ کی مخالفت یا جبر و تشدّد سے ختم کرنے کی کوشش نہ کی گئی اور نہ ایک ہی مذہب پر چلنے کی تاکید کی گئی مختلف خیال کے مذہبی علمبرداروں نے وجودیت سے لے دہریت کے نعرے لگائے یہاں تک کہ "انا الحق" کے فلسفہ کا بھی پرچار کھلم کھلا کیا گیا۔ اس کے ساتھ امام مہدی کی آمد کا بھی اعلان کیا گیا۔ ایسے بدعتی رجحانات اور ایسی تحریکیں محمد تغلق کے زمانہ میں عام ہو گئی تھیں۔

فیروز شاہ کے دور میں ایک زبردست ردِ عمل ان تمام "لامذہبیت" اور "لادینیت" کے خلاف پیدا ہوا۔ فیروز شاہ جو ملک میں اسلامی طرز حکومت قائم کرنا چاہتا تھا اس کو ان تمام غیر مذہبی اور لامذہبی قوتوں کے خلاف لڑنے کے لئے دراصل علماء کی جماعت کی رضامندی، تعاونِ عمل اور رہنمائی کی ضرورت تھی کیونکہ علماء اسلامی علوم، اسلامی قانون اور دستور کے مفسر اور محافظ تھے لہذا فیروز شاہ نے جو قدم ان تحریکوں کی روک میں اٹھایا وہ علماء کی امداد کے بغیر ممکن نہ تھا۔ نتیجے کے طور پر علماء کی جماعت طاقتور بن گئی اور ان کی نظر میں جو اسلام اور اسلامیت کا تصور تھا اس کو فیروز شاہ کی تائید اور عمل حاصل ہوا اور اس طرح ایک دور خلاف اسلامی تحریکوں کی رد میں شروع ہوا اور ملک کو ان تمام بدعقیدتی رجحانات سے پاک و صاف کیا جانے لگا جس طرح کہ فیروز شاہ کی مذہبی پالیسی سے مسلمانوں کے طبقے متاثر ہوئے، اسی طرح ہندو بھی زد میں آئے۔ گو وہ ذمی کی حیثیت

سے زندگی بسر کر رہے تھے اور ذمی ہونے کی حیثیت میں ان کی مذہبی زندگی میں حکومت مخل نہیں ہو سکتی تھی۔ ان حقوق کی حفاظت کی گئی تھی لیکن اسلامی اصول کے نقطۂ نظر سے غیر مسلم ذمی کو یہ اختیار حاصل نہ تھا کہ وہ نئے مندر تو آباد مسلمانی علاقوں تعمیر کرے فیروز شاہ نے تغلق پور، صالح پور اور کوہانہ نئے شہر آباد کئے تھے۔ یہاں ہندوؤں نے مندر بنائے۔ یہ مندر فیروز شاہ کے حکم سے توڑ دیئے گئے۔ ان مندروں کے متعلق "فتوحات فیروز شاہی" میں تفصیلی حالات ملتے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ ہندو اور مسلمان تیوہاروں کے موقعوں پر جو ان مندروں کے سلسلہ میں ہوا کرتے تھے جاتے تھے اور عورتوں کا بھی کثرت سے ان جگہوں میں آنا جانا ہوتا تھا مرد اور عورتوں کے ملنے جلنے کی وجہ سے پبلک میں عام رسوائی کے چرچے ہوا کرتے تھے اور بد اخلاقی پھیلتی جاتی تھی۔ یہ مندر اصل عقیدت اور مذہبیت کے گھر نہ بن سکے بلکہ شیطان کا وہاں راج تھا۔ فیروز شاہ نے ایک طرف اسلامی قانون کے تحت اور دوسری طرف پبلک کی بھلائی کے پیش نظر ان مندروں کو توڑا۔ فیروز شاہ نے عام طور سے بحیثیت سرکاری پالیسی کے مندر نہیں توڑے۔

Marfat.com

دسواں باب

ہندوستانی مسلمانی راج کا سرسری جائزہ

اس ضمن میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک سرسری نظر ہندوستانی مسلمانی راجوں پر دوڑائیں تاکہ یہ پتہ لگ سکے کہ آیا مسلمانوں کے بحال رکھنے یا مسمار کرنے میں مسلمانی راجوں بادشاہوں کی عام پالیسی کیا رہی ہے۔ یہ خیال عام طور سے پھیلا ہوا ہے کہ اسلام "تلوار یا موت" کا نام اُن لوگوں کے لئے ہے جو مسلمان نہیں ہیں یعنی اسلام کا قبول کرنا جان کا بچنا ہے ورنہ اسلام کی تلوار موت کے گھاٹ اتارتی ہے ہندوستان کی بیشتر تاریخی کتابوں میں یہ بیان ملتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندوستان میں غیر مسلم رعایا کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ یا تو "اسلام قبول کرو یا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو" کا تھا یہ خیال دراصل ایک تعصب، جہالت، کوتاہ نظری اور لاعلمی کا نتیجہ ہے جیسا کہ ہم پچھلے باب میں ایک جگہ کہہ آئے ہیں کہ اسلام نے اپنی تاریخی

حیثیت میں دو پہلو اختیار کئے پہلا پہلو اس کا وہ ہے جب کہ اسلام بحیثیت ایک مذہب کے تھا۔ دوسرا بحیثیت ایک سیاسی طاقت کے تھا۔ اسلام بحیثیت ایک مذہبی طاقت کے بالکل مختلف ہے اس طاقت سے جس کا نام تلوار ہے۔ اسلام بحیثیت ایک مذہب کے اپنے رویہ کو بالکل جداگانہ طور پر بزرگوں اور صوفیوں کے ذریعہ سے ظاہر کرتا ہے جو دنیا کے مختلف حصوں میں جاکر امن وسلامتی کا پیام دیتے رہے اور جنھوں نے زندگی کی عام تہذیب میں ایک بہت ہی بڑا حصہ لیا۔ اس اسلام کا تعلق اُس اسلام سے مطلق نہیں جو تلوار کی قوت کی بنا پر ملکوں کو فتح کرتا رہا یہ اصل میں اسلام نہ تھا بلکہ بادشاہوں کا "اسلام" تھا جو اپنے کو مسلمان کہتے تھے لیکن وہ مسلمان اصلی اعتبار سے نہ تھے۔ نہ ان کو اسلام معلوم تھا اور نہ اسلام کے قوانین سے واقفیت تھی اور نہ انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اسلام کے سچے اصولوں پر چل کر لوگوں کی بھلائی کر کے ثواب کمائیں ایسے اسلام کے بادشاہ ہندوستان ہی میں نہیں ہوئے تھے بلکہ وہاں بھی تھے جہاں مسلمان ہی مسلمان آباد تھے۔ خود مسلمانوں کی عام تاریخ میں جو شہادتیں ملتی ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومتیں جو اسلام کا نام لے کر چلیں وہ اصلی اسلام سے بہت دور تھیں، گو وہ سب کے سب مسلمان تھے، یہاں تک کہ چند خلیفوں کو چھوڑ کر باقی جتنے بھی خلیفہ تھے وہ مسلمانوں کے رسول اور قرآن کے احکام کو بالائے طاق رکھ کر اپنی ہوس، ابوالعزمی اور خودداری کے تحت مسلمانی زندگی پر آمر کی حیثیت میں حکومت کر گئے

Marfat.com

اس کے علاوہ مسلمانوں کی آپس کی جنگیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ ایک ہی برادری کے لوگ، ایک ہی مذہب کے لوگ، اور ایک ہی خدا کے ماننے والے لوگ اسلامی حکومت قائم نہ کر سکے اور نہ اسلامی اتحاد اور نہ اسلامی بھائی چارہ، گو دعوے سب کے یہ تھے کہ وہ ایک ہیں اور ایک مذہب کے اور ایک کتاب کے ماننے والے۔ اسلامی دنیا کی یکجہتی کا فقدان اسلام کی سیاسی قوت کو کمزور کر گیا ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت محمد کے انتقال کے ۲۱ سال بعد اصلی اسلام دنیا سے غائب ہو گیا اور سیاسی اسلام مختلف روپ اور شکل میں دنیا کے مختلف علاقوں میں ابھرتا رہا۔ ہر جگہ اسلام نے ایک مقامی قومی رنگ اختیار کیا۔ ایک عالمی اسلامی دنیا کا فقدان دراصل مقامی قومی رنگ اور اسلام کی مختلف طرز کی دنیاؤں کا نتیجہ ہے۔ جتنی بھی مسلمانی حکومتیں وجود میں آئیں وہ اس جذبہ کے تحت کہ ہر علاقہ کے مسلمانوں نے دوسرے علاقہ کے مسلمانوں سے اپنی مخصوص وحدت کو الگ سمجھا گو اسلام کے اعتبار سے ایسا نہ ہونا چاہیئے تھا۔ اس طرح اسلام کی دنیاؤں میں سیاسی یکتائیاں اپنے اپنے مقصد اور مسلک کو لے کر چلیں، اس بات کا خیال کئے بغیر کہ ان کی سیاست کاری اور سیاسی حکمت عملی کے نتائج اسلام کی یکجہتی کے لئے کیا نکلیں گے۔ یہ وہ اسلام کے روپ ہیں جو سیاسی اصولوں کے تحت پھلے پھولے۔ ان کی نشوونما مذہب اسلام نے نہ کی بلکہ اسلام کی تلوار تھی جو ایک دوسرے کو ایک دوسرے سے الگ

Marfat.com

کرتی گئی اور دشمنائی، غیرت مندی اور بے اعتنائی کے بیج آپس میں بوتی رہی۔ لہٰذا اسلام بحیثیت ایک سیاسی قوت کے مسلمانوں میں نفاق فرق اور علٰحدگی پیدا کر گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی تاریخ کے ورق خون سے لکھے گئے اور خون کی بو ان میں سے آتی ہے، گو اسلام بحیثیت ایک مذہب پُرامن زندگی کا پیام انسانوں کو دینے آیا تھا۔ ایسا ہی ہندوستان کے مسلمانی شاہوں نے بھی کیا۔ انھوں نے اسلام کی خدمت اور سیوا نہیں کی۔ وہ اسلام کے قانون کے پابند نہ رہے۔ وہ وقت اور زمانہ کے تابع تھے اور ان کو معلوم تھا کہ وقت اور زمانہ ان کی حکومت کی پائداری کے لئے کتنے اہم ہیں۔ حکمت عملی ان کی شاہی کے روپ میں کام کرتی رہی۔ ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ انھوں نے اسلام کو زندہ کرنے کی کوشش کی گو وہ اس جستجو اور کاوش میں ناکام رہے۔ کیونکہ اسلام کے پرچار کی صلاحیت ان میں نہ تھی اور نہ ان کی تربیت بحیثیت ایک خادم اسلام کے ہوئی تھی۔ وہ بادشاہ تھے۔ ان کی زبان پہ اسلام کا نام الٹ پھیر کر آتا تھا لیکن وہ اسلام کے سیوک نہیں تھے اور نہ وہ بن سکے وہ اسلامی جذبہ سے ہٹے ہوئے تھے۔ ان کے مفہوم کو نہ پہچانا تھا اور نہ سمجھا تھا اور نہ یہ معلوم کیا تھا کہ اسلام ایک مذہب ہے جہاں جہاں اسلام گیا اس کی ترقی کن محرکوں کا نتیجہ تھی وہ اس سے بے بہرہ تھے وہ یہ سمجھتے تھے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیل سکتا ہے اور پنپ سکتا بھی ہے۔ یہ ان کی غلط فہمی اور کوتاہ نظری تھی، گو انھوں نے اس بات

Marfat.com

کی کوشش بھی کی کہ اسلام کو علماء کی مدد سے زندہ کیا جائے۔ علماء کا طبقہ ہمیشہ سے عالموں کا طبقہ رہا اور جن کو درباروں میں عزت حاصل رہی تھی، وہ درباری فضا میں بڑھے، پلے اور سیانے ہوئے تھے لیکن اسلام کے پُرامن اصول زندگی کو پھیلانا نہ جانتے تھے اور نہ اس کے مفہوم کو سمجھتے تھے اور نہ جتانے کی کوشش کرتے تھے کیونکہ وہ کتابی منش تھے۔ دل میں ان کے میل، تعصب اور کدورت بھری ہوئی تھی۔ ان کا مفہوم اس اسلام سے متعلق جو تھا قدامت پسند تھا۔ انھوں نے اسلام میں ترقی پسند اصولوں کو نہ دیکھا تھا اور نہ محسوس کیا تھا۔ ان کے سامنے اسلام ایک جکڑا ہوا زبردست کڑا قانون تھا جس میں لوچ کی بجائے سختی، وسعت کی بجائے بندش، آزادی کی بجائے پابندی تھی۔ انھوں نے کبھی اس بات کی کوشش نہیں کی کہ اسلام کو اس ماحول اور روپ میں دیکھیں جب کہ وہ دنیا کے مختلف انسانوں کو اپنے اثر میں لا چکا تھا اور نہ اس بات کو محسوس کیا کہ اسلامی قانون کس طرح اپنے آزادپن میں انسانیت کے جذبہ کو فروغ دیتا ہے۔ وہ محض اسلام کے عالم تھے اور ان کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ اسلام کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں لیکن وہ اس قوت کو نہیں جانتے جو بغیر جبر و تشدد کے انسانوں کے دلوں میں انقلاب پیدا کرتی ہے کیونکہ اسلام کی روح سے وہ متاثر نہ ہوئے تھے۔ ان کے ہاں اسلام کا ظاہری روپ "اسلام" تھا۔ شاہی قوت کے تحت اسلام کے احکام

Marfat.com

کا منوانا اور اس پہ عمل کرانا ان کا شیوہ تھا جو انھوں نے اپنے سامنے رکھا۔ یعنی وہ اس اسلام کے علمبردار تھے جس کو تلوار کا اسلام کہتے ہیں یہی وجہ تھی کہ مسلمانی اور غیر مسلمانی زندگیوں پہ جو ہتیا چار اور ظلم ڈھایا گیا اس کی ذمہ داری ان ہی علماء پہ عائد ہوتی ہے جو انسانوں کے ہمدرد نہ تھے، بلکہ وہ ایک پژمردہ، بناوٹی اور ڈھونگ رچے ہوئے اسلام کے نمائندہ تھے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ علماء نے جو کھیل شاہی کی پشت پناہی میں کھیلے وہ واقعات مسلمانوں کے ملکوں میں ویسے ہی نمایاں طور سے ظاہر ہوئے جیسے کہ ہندوستان میں یعنی سیاسی قوت یا حکومت کو اکثر و بیشتر اس علماء طبقہ نے گمراہی کے راستہ پہ چلا کر بادشاہوں کو بدنام کیا۔

جس طرح مسلمان ان علماء کے ہاتھوں گمراہ ہوئے اور اپنی آزاد پسند زندگی کے میدان کو ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھے اسی طرح غیر مسلموں کو بھی ان سے نقصان اور ضرر پہنچا گو دعوے ان کے یہ تھے کہ وہ اسلام کے قانون کی سچی ترجمانی شاہی احکام کے ذریعہ سے کر رہے ہیں اور کروا رہے ہیں۔

ہندوستان میں قدیم ترین زمانہ سے مورت پرستی کے خلاف مختلف زمانوں میں قوی ردعمل پیدا ہوتا رہا اور انسانوں کے سامنے اس نظریہ کو بھی پیش کیا گیا کہ وحدت کا اصول اعلیٰ زندگی کی پرداخت اور تہذیب کے لئے بہت ہی مقدم اور ضروری ہے۔ انسان مورت پرستی کے ذریعہ سے اپنے میں دنیاوی، مادی جذبات اور خواہشات کو پیدا کرتا ہے اور وحدت کا اصول انسانی تہذیب اور روحانیت ہے۔ یہ تحریکیں

Marfat.com

مسلمانوں کے آنے سے بہت قبل ہندوستان کی دنیا میں پھیل چکی تھیں اور ان کے اثرات بھی رونما ہو چکے تھے۔ برہمنیت اور خلاف برہمنی تحریکیں جو ہندوستان میں چلی تھیں ان کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مذہب کی روح اور مذہب کے روپ میں فرق ہے۔ اس فرق کی وضاحت صدیوں تک ہمارے ملک کے پہنچے ہوئے ذی فہم اور سلجھے ہوئے لوگوں نے کی اور ایک ایسی فضا ملک میں پیدا کی جس کا نتیجہ آزاد پسند خیال اور امن پسند زندگی تھا۔ ہمارے پروہت بھی دراصل اسلام کے علما کے ہم رتبہ تھے۔ ان کی ذہنیت بھی وہی تھی جو اسلام کے "پنڈتوں" کی رہی تھی۔ انھوں نے بھی مذہب کے روپ کو ہمیشہ اصلی مذہب سمجھا اور لوگوں کو روح کے راستہ پر چلنے سے گمراہ کیا۔ لہذا یہ پنڈت مختلف حیثیتوں میں ہندوستان کی صدہا سال تاریخ میں اہم ترین کھیل کھیلتے رہے

اس سلسلہ میں اس بات کی وضاحت بہت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے آنے سے پہلے اس ملک میں مختلف دوروں میں مذہبی رواداری کے متعلق حکومت نے کیا رویہ اختیار کیا تھا۔ ہندوستان کی ابتدائی تاریخ میں مذہبی دنیاؤں کا تصادم ہوا، لیکن تلوار کا استعمال مذہب کے پرچار میں نہیں کیا گیا۔ مذہبی علمبرداروں نے جو تحریکیں ملک میں چلائی تھیں ان سے خیالوں کا تضاد تو ضرور ظاہر ہوا لیکن جبر و تشدد کا استعمال اس اعتبار سے کہ لوگ قوت کے دباؤ کی وجہ سے مذہب بدلیں بہت کم دکھائی دیا، گو ایسے واقعات حکومت

کے دباؤ سے کہیں کہیں نظر آنے لگے۔ ہمارے ملک کی تاریخ میں ایسی مثالیں ملی ہیں۔ عام طور سے ساتویں صدی تک ہندوستان میں رواداری کا اصول کام کرتا ہوا دکھائی دیا لیکن ساتویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک جب کہ ہندوستان میں برہمنیت کا ایک نیا دور جو سیاسی قوتوں سے میل کھا کر ہندوستانی زندگی کی شدت میں اضافہ کرتا ہے ملک پر چھا گیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برہمنی تحریک جو اپنے کو زندہ کرنا چاہتی تھی اس کو دوسرا جنم سیاسی قوتوں کی مدد سے ملا۔ یہ برہمنی تحریک ظاہر تو پرانے اصولوں پر چلتی ہوئی نظر آئی لیکن اپنے مسلک کے حاصل کرنے میں اس نے حکومتوں پر دباؤ ڈالا تاکہ ملک میں ایک ہی طرح کا مذہب قائم ہو یعنی دھرم شاستر کی مذہب۔ یہ برہمن تحریک تمام دوسرے مذہبوں کے خلاف تھی اور جہاں جہاں اس کا بس اور زور چل سکا وہاں اس نے دوسرے مذہبوں کی نشانیاں مٹا دیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ برہمن نے تلوار اپنے ہاتھ میں لئے بغیر وہ کام کیا جو ایک جابر کرتا ہے یہی وجہ تھی کہ برہمنیت کے زور پکڑنے کے بعد ہندوستان میں غیر برہمنی مذہب مثلاً بدھ مت اور جین مت جن کا دائرہ اثر کافی وسیع تھا۔ بے حد محدود ہونے لگا۔ ایک وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں بدھ متی اصولوں کی گونج سنائی دیتی تھی اور اب وہ زمانہ آگیا جب کہ ان کے بڑے اور چھوٹے تہذیبی مرکز بھی اپنی جغرافیت و نابود ہو گئے یا یوں کہئے کہ ان مرکزوں پر برہمنی تسلط قائم ہوا۔ یہ طریقہ برہمنی

تبلیغ کے ان اثرات کو عیاں کرتا ہے جس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ بدھوں اور جینیوں کے مقدس مقامات کی توہین اور بربادی برہمنیت کے ہاتھوں اس خوبی کے ساتھ ہوئی کہ تاریخ بھی اپنے ورقوں میں ان کا ذکر کرنے سے ڈرتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں ایسی مثالیں بھی ہماری تاریخ میں ملتی ہیں کہ بعض راجاؤں نے مختلف جذبہ کے تحت مندر لوٹے اور توڑے بھی ہیں۔ یہ زمانہ وہ تھا جب کہ مسلمانی قوت کا وجود ہندوستان میں نہ تھا۔

مسلمانوں کی یا ایسی یا ایسی ہی حکمت عملی مندروں سے متعلق جو رہی اس کی کہانی دلچسپ ہی نہیں بلکہ تاریخ کی الجھی ہوئی گتھیوں کو بڑی حد تک سلجھا دے گی۔ مندروں کی مسماری جو مسلمان حکمراں کے زمانہ میں ہوئی اس کے متعلق بہت سے من گھڑت غیر تاریخی قصے بھی گھڑے گئے تاکہ یہ ثابت کیا جائے کہ مسلمان بادشاہوں کا سب سے اولین فرض یہ تھا کہ وہ مندروں کو مسمار کریں تاکہ کفر کا خاتمہ ہو اور اسلام کو رونق حاصل ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ایک شرعی حکومت میں جہاں کا بادشاہ مسلمان ہو، کیا اس پر یہ فرض قانون اسلام کے مطابق عائد ہوتا ہے کہ وہ غیر مسلمانوں کے مذہبی عقائد کو ٹھیس پہنچائے اور ان کی عبادت گاہوں کو برباد کرے۔ شرع کے بموجب اسلامی حکومت اس اصول کو روا رکھتی ہے کہ وہ ان ذمیوں کے جان و مال، ان کے عقائد

اور ان کی عبادت گاہوں کی نگرانی اور حفاظت کرے اور جب کہ اسلامی
حکومت زرِ ذمیاں لے چکی ہے تو کسی بھی طرح کا تشدد یا جبر جب کہ
ذمی ایک پُرامن زندگی بسر کر رہے ہوں، نہیں کر سکتے۔ اگر وہ ایسی
حالت میں ذمیوں کے مقدس مقامات پر ہاتھ لگاتی ہے اور ان کو برباد
کرتی ہے تو وہ حکومت دراصل شرعی حکومت نہیں اور نہ اسلامی قانون
کی پابند سمجھی جا سکتی ہے۔ اس کا ایسا فعل غیر قانونی اور غیر شرعی ہے
ایسی حالت میں وہ معاہدے جو ذمیوں کے ساتھ ہوئے وہ یک لخت
ٹوٹ جاتے ہیں بلکہ قانون اسلام تو یہاں تک جاتا ہے کہ ذمی حکومت
پر دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ان کے مقدس مقامات کی بحالی کی جائے۔ اسلام کا
قانون یہ ہے کہ اگر مسلمان بادشاہوں نے اسلام کے قانون کی پابندی
نہ کی اور من مانی طور پر ایسا کام کیا جو ایک جابر حکمراں کرتا ہو تو وہ دراصل
مسلمان بادشاہ کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ ایسے مسلمان بادشاہ جنھوں نے
اسلام کے قانون کے خلاف عمل کیا تو ان کا عمل ہر حالت میں اور ہر صورت
میں خلاف اسلامی رہا۔ ان کے جانچنے کی کسوٹی اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ
اسلام نہیں اور نہ اس کا قانون ممکن ہے کہ آمر حکمراں گو مسلمان ہو آمریت
کے اصولوں پر چل کر ایک غیر منصفانہ اور غیر قانونی فعل اختیار کرتا ہے
تو اس کی حرکتوں سے اسلام پر حرف نہیں آتا۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان حکمرانوں نے اپنے اپنے
دور میں مندروں کی مسماری کی۔ اس سے پہلے کہ ہم اس بات کا تصفیہ

Marfat.com

کریں کہ ان حکمرانوں نے کس جذبہ کے تحت مندر ڈھائے۔ ہم یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ آیا یہ مسلمان حکمراں شرع کے پابند تھے یا انھوں نے اپنی حکومت کو شرعی بنانے کی کوشش بھی کی تھی۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کے بیشتر حکمرانوں نے اس بات کی کبھی پروا نہیں کی کہ آیا ان کی حکومت قانون اسلام پر کاربند ہے یا نہیں گو حکومت کے انتظام میں جو اسلامی اصطلاحیں استعمال کی گئی تھیں ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان میں اسلامی اصول کارفرما تھے مثلاً "بیت المال" جس کے معنی اسلامی نقطۂ نظر سے دوسرے ہیں لیکن ہندوستان میں یہ لفظ بحیثیت "سرکاری خزانہ" کے استعمال کیا گیا۔ اسی طرح "لشکر اسلام" کا لفظ تاریخوں میں استعمال کیا گیا گو "لشکر اسلام" دراصل اس لشکر کو کہتے ہیں جو اسلام کی راہ میں لڑے نہ کہ فوجی سیاسی جنگیں لڑے جیسا کہ ہمارے ملک میں ہوا ہے۔

قانون اسلام کے بموجب مسلمان حکمراں کا یہ سب سے بڑا فرض تھا کہ وہ جب کسی ملک کو فتح کرے تو اس بات کا اعلان کرے کہ وہ ملک پر جس حکومت کو قائم کرنا چاہتا ہے وہ اسلامی ہوگی اور غیر مسلم لوگ اگر اس اسلامی حکومت میں رہنا چاہتے ہیں تو انکو امان مل سکتا ہے اور ان کی جان و مال کی حفاظت، ان کے عقیدے کی آزادی اور ان کے مقدس مقامات کی نگرانی اور حفاظت ہوگی جب کہ وہ ذمی کی حیثیت میں رہنا چاہیں۔ ایسا اعلان عربوں نے صرف سندھ کی فتح کے سلسلہ میں کیا تھا۔

Marfat.com

لیکن دوسرے جتنے بھی مسلمان حکمران ہندوستان کی تاریخ میں گزرے انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ گو ہمیں صرف دو مثالیں ان مسلمان حکمرانوں مثلاً فیروز شاہ تغلق اور اورنگ زیب کی ملتی ہیں جنھوں نے اس بات کا اعلان کیا کہ ان کی حکومت شرع کے اصولوں کی پابند رہے گی لیکن یہ اعلانات اس نوعیت کے نہیں ہیں جیسا کہ ملک فتح کیا جا رہا ہو۔ حکومتیں قائم تھیں اور ان کو اسلامی بنانے میں شروع سے کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ یعنی سوال ملک کی نئی فتح کا نہیں پیدا ہوا اور نہ اعلان کے ذریعہ یہ دریافت کیا گیا کہ کون ذمی کی حیثیت میں رہنا چاہتا ہے اور کون نہیں رہنا چاہتا ہے۔ ان حکمرانوں کے اس فعل سے حکومت کو شرعی بنانے کی کوشش ضرور نظر آتی ہے لیکن اسلام کے قانون پر حقیقی معنی میں پوری طرح عمل نہیں ہوتا ہے۔

مندروں کی مسماری کے مسئلہ میں اور زیادہ پیچیدگی اور الجھن پیدا ہو جاتی ہے جب کہ تاریخ یہ شہادت پیش کرتی ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے جزیہ بھی لیا اور مندر بھی توڑے، گو شرع کے بموجب ذمہ لینے کے بعد ایک اسلامی حکومت پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ وہ غیر مسلموں کے مقدس مقامات پر ہاتھ لگائے۔ اگر ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے قانون اسلام کے خلاف تخریبی پالیسی مندروں سے متعلق اختیار کی تو وہ واجب نہ تھی بلکہ یوں کہا جائے کہ انھوں نے اسلام پر عمل نہیں کیا اور من مانی طور سے حکومت کرنے کی کوشش کی۔ یا تو وہ

Marfat.com

مسلمان نہ تھے اور انھوں نے جو کچھ بھی کیا وہ اپنی ہوس اور دل کی تعصبانہ خواہش کو پورا کرنے کے لئے کیا اور اگر وہ مسلمان تھے اور اسلام کا قانون ان کا ایک سچا عقیدہ تھا تو ان کو مندروں کی مسماری اصولاً نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ لیکن ہندوستان کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے جہاں مندر توڑے وہاں اس قسم کی شہادتیں بھی چھوڑی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مندروں کی بحالی کے لئے اوقاف دیئے گئے جو نسلاً بعد نسلاً آج تک ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اورنگ زیب کے زمانہ کی تاریخیں اس بات کے بیان کرنے میں گریز نہیں کرتیں کہ اورنگ زیب کے احکام کے تحت ہندوستان کے مختلف علاقوں کے مندر توڑے گئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اورنگ زیب کے زمانہ کے شاہی فرمان ایسے بھی کافی تعداد میں ملتے ہیں جن کے پڑھنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس نے مندروں کی بحالی کے سلسلہ میں اوقاف بھی دیئے تھے۔

یہ سوال کہ حکمرانوں نے مندر توڑے اور ان کی سرپرستی بھی کی ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب اسلامی نقطۂ نظر سے نہیں دیا جا سکتا اور اگر دیا بھی جا سکتا ہے تو اس طرح سے کہ یہ وہ نئے مندر ہوں گے جن کی تعمیر کی اجازت اسلامی ریاست میں نہیں ہو سکتی کیونکہ اسلام کے قانون کی رو سے جب مسلمان نئے ملک فتح کرتے ہیں اور ذمی ان کے امان میں آتے ہیں اور زر ذمیان دینا تسلیم کرتے ہیں تو انکی

پرانی عبادت گاہیں حکومت محفوظ رکھتی ہے لیکن ذمیوں کو اس بات کی اجازت قانون اسلام کی رو سے نہیں ہے کہ وہ نئی عبادت گاہیں بنا سکیں ہماری تاریخ اس قسم کی شہادتیں دیتی ہے کہ مسلمانی دور میں سرکاری روپے سے مندر بنائے گئے۔ یہ وہ روپیہ تھا جو سرکار کا تھا لیکن لوٹا ہوا تھا۔ اس طرح ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ غیر مسلموں نے مسلمانی زمانہ میں مسجدیں بھی ڈھائیں۔ مسجدوں اور مندروں کا ڈھانا کچھ زمانہ کے رجحان سے بہت قریبی تعلق رکھتا ہے نہ کہ مذہبی جوش و خروش سے۔ ممکن یہ بھی ہو کہ جنگی حالات میں مقدس عمارتیں ڈھائی گئی ہوں جس میں مسجد اور مندر دونوں شامل تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہماری تاریخ یہ شہادت کافی قوی طور سے دیتی ہے کہ ملک میں عام جبری تبلیغ کہیں نہیں دکھائی دیتی نہ بادشاہوں کی تاریخوں میں اس امر کی وضاحت ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے لوگوں کو جبری اسلام کی دعوت دی اور تلوار کے زور پر ان کو مجبور کیا کہ وہ اسلام قبول کریں۔ اگر ایسا ہوتا تو ملک میں عام ہنگامے برپا ہوتے۔ مسلمان تاریخ دانوں کا اکثر و بیشتر یہی گلہ اور شکوہ ہے کہ ہندوستان کے حکمرانوں نے اسلام کی اشاعت کے لئے کچھ نہیں کیا اور غیر مسلموں کے ساتھ ان کی رواداری اور انسیت غیر اسلامی اصول کا پیش خیمہ تھی۔ ان ہی تاریخ دانوں اور قصیدہ گویوں نے اپنے حکمرانوں کو اکسانے اور اشتعال دلانے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی بلکہ ان کو جن القاب سے نامزد کیا ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے محافظ سمجھے جاتے

تھے، لیکن وہ اس اصلیت سے بہت دُور تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ ہندوستان پر کس طرح حکومت ہو سکتی اور کی جا سکتی ہے۔ اسلام کو ان کی خدمات کا محور یا مرکز تصور کرنا تاریخی اصلیت سے گریز کرنا ہوگا۔

ہندوستان کی تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مندروں کی مسماری دراصل لڑائی کے زمانہ میں زیادہ نمایاں طور سے نظر آئی اور امن کے زمانہ میں اس میں بے حد کمی واقع ہوئی۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ ہندوستان میں ایسی مقدس عبادت گاہیں بھی تعمیر کرائی جا رہی تھیں جو ایک بد اخلاق زندگی کا گہوارہ بنی ہوئی تھیں جہاں عقائد کی درستی کے بجائے زندگی کے شہد پن کے مظاہرے ہوا کرتے تھے۔ مندروں کی مسماری میں دولت کے عنصر کا بہت ہی بڑا حصہ ہے۔ ایسا دیکھنے میں آیا کہ مندر وہی مسمار ہوئے یا کئے گئے جہاں کثیر دولت اکٹھا تھی۔ وہ ہمیشہ لشکر کشی کا کام کرتی رہی اور بادشاہوں کے دل کو موہ لیتی رہی۔ اس بات کی تصدیق ہمیں ہندوستان کے ان بھگتوں کی تعلیمات سے ہوتی ہے جنھوں نے زندگی کے اخلاق، عقائد کی درستی، اچھے چلن اور نیک ریت کے پرچار کے سلسلہ میں انسان کی زندگی کو خدا کا ایک گھر تصور کیا اور مندروں کو شیطان کا۔ ہمارے بھگت زندگی کی ایک نئی روش اور ڈگر کے متلاشی تھے۔ وہ دراصل اس زمانہ کے ردعمل کا نتیجہ تھے۔ ان کی تعلیمات میں ہمیں اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے حکمرانوں سے کوئی خوش نہ تھے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکمران ملک والوں سے کوئی خاص گہری دلچسپی نہیں

Marfat.com

رکھتے اور نہ خلق خدا کی فلاح و بہبود کا ان کے پاس کوئی لحاظ تھا۔ ان بھگتوں نے کھلم کھلا اس بات کو عام کر دیا کہ حکمرانوں کا مسلک جہانگیری ہے نہ کہ جہانبانی، خود غرضیاں ہیں نہ کہ رعایا کی بہبود اور ملک کی بھلائی، بدعقائد ہیں نہ کہ نیکی، راستبازی اور صداقت۔

کہا یہ جاتا ہے کہ مسلمان حکمراں دراصل اسلام کے سب سے بڑے خادم گزرے ہیں۔ شہادت یہ بتاتی ہے کہ اسلام کے سچے خادم دراصل صوفیائے کرام تھے یا وہ مسلمان بزرگ جو اس ملک کے مختلف حصّوں میں آن کر بسے۔ ان کی زندگی کا مقصد وہی تھا جو ہمارے بھگتوں کا رہا ہے۔ یہ طبقہ ہندوستان کے لوگوں میں سے وہ طبقہ تھا جس نے اپنی زندگی خدا کی خدمت میں وقف کی اور ان کا ایمان اور یقین علاً یہ رہا کہ بندہ کی خدمت خدا کی خدمت ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو درباروں سے دور اور بادشاہوں کے ڈر اور غضب سے بے پرواہی نہیں بلکہ ان کو شاہی قوت و سطوت، نشہ و زور، رعب و دبدبہ سے انتہائی نفرت تھی۔ ان کا مرکز عوام تھا نہ کہ محلات یا شاہی درباداریاں۔ تاریخ شاہد ہے کہ وہ بادشاہوں سے قریبی ربط نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کی کنارہ کشی، تامل اور بے اعتنائی ظاہر کرتی ہے کہ وہ شاہی سرپرستی کی چھاؤں میں پلنا نہیں چاہتے۔ جس طرح بادشاہوں کی سطوت اور قوت سیاسی دنیا میں یکتا تھی اور مانی جاتی تھی ویسے ہی بھگتوں اور صوفیوں کی عزت عوام کے دل میں ممتاز درجہ رکھتی تھی۔ اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بادشاہوں

کو ان بزرگوں کے پاس جانا پڑا اور ان بزرگوں نے شاہی مرکزوں میں آنے سے انکار کیا۔ تاریخ کی ورق گردانی سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ مسلمان حکمرانوں کی جانب سے اسلام کی تبلیغ نہیں ہوئی۔ جو چند مثالیں لوگوں کی یا خاندانوں کی مذہب کی تبدیلی کے سلسلہ میں ملی ہیں ان کا تعلق دراصل اصلی مذہب کی تبدیلی سے اتنا نہیں ہے جتنا کہ سیاسی اور اقتصادی وجوہ سے۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ہر ملک میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو حکومت سے فائدہ اٹھانے کی خاطر حکمرانوں کے "مذہب" کو اختیار کرتے ہیں ایسا اس زمانے میں بھی ہوا جس کا تعلق تبلیغ اسلام سے نہیں بلکہ جذبۂ ترقی اور اعزاز سے تھا۔ اگر مسلمان حکمراں واقعی میں اسلام کی جبری تبلیغ کرتے تو ان کے مرکز کی بیشتر تعداد مسلمان دکھائی دیتی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی راجدھانیوں میں جو مخلوق آباد تھی وہ بیشتر غیر مسلم تھی۔ یہ ہماری تاریخ کی عام خصوصی شہادت ہے۔ تبلیغ کے سلسلہ میں مسلمانوں کی بستیاں وہ تھیں جو شاہی مرکز سے کوسوں دور اور جہاں اسلام کے خادم صوفی بسے ہوئے تھے۔ انھوں نے اسلام کی خدمت کے سلسلہ میں جو کارہائے نمایاں کئے وہ دراصل امن کا پیام، انسان کی رواداری، خدا کے بندوں کی مساوات اور آپس کے بھائی چارہ کا پرچار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب کبھی مرکز کا تختہ الٹا تو ہندوستان کی عام جنتا ہندو اور مسلمان نے امن قائم رکھا اور اکثر ایسا بھی سننے میں آیا

Marfat.com

کہ ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کس حکمراں کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی ہندو مسلم زندگی اپنے قدرتی قانون کے تابع نشو و نما پاتی ہوئی زمانہ کے نشیب و فراز اور اس کی گرم و سرد کروٹوں سے محفوظ تھی۔

اس مختصر سماجیاتی حالات کے مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مسلمان حکمراں نہ اصلی معنوں میں مسلمان تھے اور نہ اسلام کے اصولوں کی صحیح طرح سے ترجمانی کر سکتے تھے، نہ اس بات میں کامیاب ہوئے کہ ہندوستان میں شرعی حکومت قائم کریں اور نہ اس اصول کو زندہ رکھ سکے کہ مسلمان ہوتے ہوئے اسلامی شعار زندگی کو اختیار کریں اور نہ اس بات کی کوشش کی کہ اسلامی اصول کو کس طرح عوام کی زندگی کے لئے ہدایت کا نمونہ بنا سکیں۔ ان کی حکومت سیاسی تھی اور وہ دراصل اس کو سیاسی بنانے میں کامیاب ہوئے اور نہیں بھی اپنے من مانی اصولوں کو سیاسی رنگ میں رنگ کر حکومت کر گئے۔ نتیجہ کے طور پر وہ اس میں کامیاب ہوئے اور ناکام بھی۔ ممکن تھا کہ انکی زندگی اور زیادہ نمایاں طور پر کامیاب نظر آنے لگتی اگر دنیادار علماء ان کے مشیر نہ ہوتے۔ حکمرانوں کی قانون اسلام سے ناواقفیت بھی ان کے راستے میں روڑا بنی اور ان کے خلاف شرعی رویہ میں جو بل پڑا اس کی یہی وجہ ہو گی۔

اب ہم اس گریز کے بعد ہندوستانی حکمرانوں کی سیاسی ذہنیت

کی کہانی کو فیروز شاہ تغلق کے بعد سے شروع کرتے ہیں تغلق شاہی کے خاتمہ کے بعد ہندوستان میں افغانوں کا راج شروع ہوتا ہے۔ یہ افغانی راج اپنے عمل اور طریقہ کے اعتبار سے وسیع النظری کے اصول کو پیش نہیں کرتا کیونکہ افغان قبیلہ دنیادارانہ ذہنیت رکھتے تھے اور ان کا دائرہ عمل بھی دنیادارانہ تھا۔ ان کی ذہنیت ان کے راج کے دور میں بھی نمایاں رہی۔ ملک گیری کی ہوس ان میں کافی سے زیادہ تھی۔ نظریہ اور خیال کی بلندی اور وسعت کی کافی کمی تھی جو دستور، قاعدے اور ضابطے پیشرو حکومت نے قائم کئے تھے ان ہی کو انھوں نے بحال رکھا۔ ان پر ہندوستانی ماحول اور فضا کا اثر کم چڑھا۔ عملی سیاسیات میں ان کو اچھی خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ گو مسلمانی جوش و خروش ان کی طبیعت میں اکثر دوڑتا تھا لیکن حکمت عملی اور سیاست کاری کی مجبوریوں سے وہ اپنے مذہبی ولولوں کو عملی جامہ پہنا نہ سکے۔ اس افغان شاہی کی نمایاں شخصیت شیر شاہ سوری کی تھی۔

شیر شاہ سوری ہندوستان کے ان عقلمند، دوراندیش اور سیاستداں مدبر حکمرانوں میں سے ہے جس نے ملک کی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسے کام کئے کہ اس کا نام ملک کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا یہ ایک عملی انسان تھا اور اس لحاظ سے اس کا کل دور ایسی اصلاحوں کا آئینہ دار ہے جس سے ملک اور لوگوں کو انتہائی فائدہ پہنچا۔ اس کی یہی اصلاحات مغلوں کے دور میں بھی قائم رہیں۔ شیر شاہ سوری نے

اپنی رعایا۔ ہندو اور مسلمان کو ایک نظر سے دیکھا اور اس بات کا خیال رکھا کہ رعایا کے دل کو ٹھیس نہ پہنچائے یعنی ان کے مذہبی جذبات تر و تازہ رہیں۔ اس کی روادارانہ پالیسی کا نتیجہ تھا کہ ملک میں ہندوؤں مسلمانوں کو مساوی انصاف اور مرتبہ ملا۔

اس سے پہلے کہ ہم مغلوں کا ذکر کریں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس بات کا بھی ذکر کریں کہ مغلوں سے قبل کے حکمرانوں نے ہندوستان میں کہاں تک کامیابی حاصل کی۔ جیسے جیسے ملک میں مسلمان حکمرانوں راج پھیلتے گئے ویسے ہی ان کے تعلقات ملک والوں سے بھی قریب تر ہوتے گئے۔ انھوں نے وقت کے ساتھ اپنی زندگی میں تبدیلی ہوتی ہوئی دیکھی۔ یعنی وہ اپنے کو بدیسی نہیں سمجھنے لگے بلکہ ملک کے اغراض و مقاصد سے گہری وابستگی اور دلچسپی لینے لگے، یہاں تک کہ تھوڑے ہی عرصے کے اندر مسلمانی ریاست نام کو مسلمانی تھی لیکن وہ کلیتاً ہندی ہو گئی تھی۔ اس ہندی رنگ کے چڑھنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان حکمرانوں نے زیادہ تر ہندوستان کی عورتوں سے شادی بیاہ کئے تھے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تخت مسلمانی تھا لیکن محلات ہندی۔ اس ہندوستانی اثر نے اپنا ہر طرح کا رنگ جمتا ہوا دکھایا۔ ہندوستان کے تیوہارات، رسومات، ریتیں، طریقے اور طرحیں سب کی سب اپنے مختلف روپوں میں مسلمانی شاہی زندگی سے لیکر ادنیٰ مسلمان تک اپنی اپنی جھلکیں دکھا رہی تھیں۔ اس زمانہ میں جیسے کہ ہندوستان کی طرز زندگی اور اس کے

Marfat.com

اثرات نے مسلمانوں کو متاثر کیا تھا اسی طرح رفتہ رفتہ ہندوستان کے لوگ بھی مسلمانی اصولوں، نظریوں، جذبات، عادات، رسم و رواج، آداب اور تہذیبی قوتوں سے اثر لے کر اپنی زندگی میں نیا پن، نیا ڈھنگ نئی روش اور نیا طرز محسوس کرنے لگے۔

حکمرانوں کے مفاد کی کامیابی محض مسلمانی قوت کی بنا پر نہیں ہوئی بلکہ اس میں ہندو اسیوں کا بھی ہاتھ تھا جو اپنے مالک کی ترقی اور زوال کے ساتھ اٹھتے یا گرتے تھے۔ کسی بھی جذبے کے تحت مسلم حکمرانوں نے ہندوستان کے علاقوں کو فتح کیا ہو لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ جتنی بھی دولت ان کے ہاتھ آئی وہ تقریباً سب کی سب اسی ملک میں خرچ ہوئی۔ وہ روپیہ ہندوستان کے باہر نہیں گیا جیسا کہ انگریزی راج میں ہندوستان کی دولت باہر جاتی رہی۔ اس دولت کا صرفہ جس اعتبار سے بھی کیا گیا اس کی ذمہ داری زمانہ کی ذہنیت، اس کے رجحان اور اس کے تقاضے پر رکھی جا سکتی ہے۔ اس دور کی صنعتی اور فنی ترقی میں حکمرانوں نے جو بے انتہا دولت صرف کی وہ ایسا کارنامہ ہے جس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کے لاکھوں لوگ اس دولت کی لکاسی کی وجہ سے پلے ہی نہیں بلکہ اپنے میں فن کارانہ صلاحیتوں کو ترقی بھی دے سکے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کے گوشہ گوشہ میں صنعت و حرفت بڑھتی گئی اور ہندوستان کی شہرت دنیا میں ایک اعلیٰ صنعتی اور فنی مرکز کی حیثیت سے پھیل گئی۔ ہندوستان کی اس ناموری

Marfat.com

میں مسلمان حکمرانوں کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ اس اثر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان حکمرانوں نے ملک کو خوبصورت بنانے میں، اس کی شائستگی کرنے میں اور اس کی شکل نکھارنے میں بے حد کامیاب کوششیں کیں ان کے معیار جتنے بھی تھے وہ اس زمانہ کے تھے جب کہ دنیا قدیم تھی۔ یا قدامت پسند تھی۔ اس زمانہ کا انصاف بھی قدامت پسند اصولوں پر مبنی تھا۔ اسی طرح رحم اور بے رحمی بھی عہد وسطیٰ کی زندگی کے قانون کے تابع تھی یہ بھی نہیں کہ حکمراں کی زندگی میں اپنے قانون کو بلکہ عوام کی زندگی پر بھی اس کا غلبہ تھا۔ تعصبات اور توہمات، جہالت اور لاعلمی کے آثار اسی طرح عام زندگی پر غالب تھے جیسے کہ شاہی زندگی پر لوگوں کا عام یقین تھا کہ بادشاہ خدا کا سایہ ہے دراصل وہ زمین پر خدا ہے اور اس وجہ سے ملک والوں نے بادشاہ کو ایک دیوتا سمجھا اور دیوتا ہونے کی حیثیت سے اس کے احکام بجا لائے۔ عام ہندوستانی زندگی کی تنظیم بھی قدیم ہندوستانی سماجی اصولوں پر مبنی تھی انسان کی آزادی کا تصور عنقا تھا۔ اسی تنظیم میں مسلمانی زندگی بھی جکڑی ہوئی تھی۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ہندو اسی لیے مسلمان ہوئے ان کی زندگی میں تو کوئی گہرا انقلاب واقع نہ ہوا لیکن ان کے اعتقاد میں ضرور ہوا تھا۔ لہٰذا وہ عقیدے کے اعتبار سے مسلمان تھے لیکن ان کی زندگی خالص ہندی تھی۔ اس لحاظ سے ان کی زندگی اسلامی اور ہندی مذہبی اصولوں، نظریوں، جذباتوں، عقیدوں اور رسم و رواج کا ایک زندہ نمونہ تھی۔

Marfat.com

گیارھواں باب

مغل دور کے چند ممتاز بادشاہوں کی تمدنی خصوصیات

مغلوں سے قبل کے ہندوستان میں سماجیاتی قوتیں آپس میں ٹکر کھا کر ملیں اور الگ بھی ہوئیں۔ قدیم ہندوستان کی زندگی کا سلسلہ بے روک ٹوک اپنی رفتار کو نئے اثرات کے رنگ میں کبھی شوخ اور کبھی مدھم پڑتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ پرانا ہندوستان اپنے رسم و رواج، اپنی ریت، اپنے قاعدے، اپنی طبیعت اور اپنے رجحان کو ساتھ لے کر ایک بدلتے ہوئے زمانہ سے گزارتا اور اپنے میں رفتہ رفتہ نئی اسپرٹ، نئی قوت، نیا اثر، نیا طرز اور نئی فکر محسوس کرتا تھا۔ ان تمام سماجیاتی قوتوں کا اثر ہمارے ملک میں ایک دم سے ظاہر نہ ہوا کیونکہ جب کسی ایک ملک کی تہذیب اور اس کا تمدن کسی دوسرے ملک کی تہذیبی اور تمدنی قوتوں سے ٹکراتی ہے تو ملک کی زندگی کی شکلوں کے نکھرنے میں یعنی نئے اداروں اور

طریقوں کے بننے میں اور عادتوں اور رویوں کی تبدیلی میں، وقت لگتا ہے۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی خصوصیت یہی رہی۔ مغلوں کے پہلے حکمرانوں نے جو کچھ بھی کیا اس میں سیاست کاری اور راج نیتی کا زیادہ اثر دکھائی دیا نہ کہ تہذیبی قوتوں کا۔ اس میں شک نہیں کہ ان حکمرانوں میں سے چند ایسی ہستیاں گزری ہیں جن کے ہاتھوں ہندوستان کی بھلائی کا مسلک پروان چڑھا اور ایک اعلیٰ تہذیبی مقام پر بھی پہنچا۔ گو انھوں نے ہندوستان کی تہذیب ایک کل ہندی پیمانہ پر نہ کی لیکن ملک کے مختلف حصّوں میں ہندو مسلمانی رجحانوں کے تحت تہذیبی قوتیں ترقی پا رہی تھیں۔

مغل دور میں دراصل اس بات کا چرچا اور پرچار رہا کہ ہندوستان کی جانچ پڑتال، تعمیر اور پرداخت، بناؤ اور سجاؤ، کل ہندی تہذیبی نقطۂ نظر سے کی جائے۔ اس لحاظ سے ہمارے ملک کی تاریخ میں اس کو ایک خصوصی امتیاز حاصل رہا۔ اس امتیاز اور خصوصیت کی وجہ مغلوں کی ذہنیت اور اٹھان تھا۔ سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسئلوں کے سمجھنے میں انھوں نے انسانی مسلک اور اصول کو برتا۔ عہد وسطیٰ کے تمام حکمرانوں میں مغل حکمران ہی وہ لوگ تھے جن میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ معاملات کو انسانی نظر اور ہمدردی سے دیکھ سکیں۔ ان کی تمام تر کوششیں اس بات کا پتا دیتی ہیں کہ ان کی اسپرٹ کی کارفرمائی اور ان کے عمل کا دائرہ بڑا اور وسیع تھا۔ ہر کام کی انجام دہی میں اس کسوٹی

Marfat.com

کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس خاندان کا آغاز بابر سے ہوتا ہے جو بہادری جفاکشی، سپاہگری، علمی ذوق، قدرت پسندی، سچی دوستی اور ہمدردی جیسے انسانی خوبیوں کا ایک زندہ نمونہ تھا۔ اس کی شخصیت کے مختلف روپوں کا اندازہ "توزک بابری" سے بخوبی لگتا ہے۔ اس کی زندگی آزمائش اور جستجو کی یادگار ہے مصیبتیں، تکلیفیں اور کٹھنائیاں بابر کی زندگی میں تہذیبی سہاگے کا کام دے گئیں۔ گو بابر نے ہندوستان پہ تھوڑے عرصہ ہی حکومت کی، لیکن اس کی سیاسی فطرت اور انسانی نظر نے بھانپ لیا کہ ہندوستان میں مغل حکومت کا استحکام اور پائیداری محض جہانگیری قوت سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے ذریعے حکومت کی بنیادیں مضبوط نہیں ہوتیں۔ ایسی بے بنیاد حکومت کا شیرازہ جلد سے جلد بکھر سکتا ہے۔ اس کو اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ مغل راج ایک اصلیت ہو جائے گا۔ ایسے راج کے قیام اور اس کے استحکام میں بابر کی انسانی قوت اس کی رہنما ہی نہ بنی بلکہ مغل حکمرانوں کی انسان پسندی بھی کام آئی۔ شروع شروع میں بابر کو اس ملک سے نہ کوئی ہمدردی تھی اور نہ دلچسپی۔ نہ اس ملک کی فضا نے اس کو متاثر کیا اور نہ اس کے لوگ اور اداروں نے اس کے دل کو موہ لیا۔ وہ اجنبیوں کے ملک میں اپنے کو فاتح سمجھتا تھا لیکن بابر کی انسانی فطرت اور نظر کا یہ کارنامہ تھا کہ اس نے اجنبیوں کو اپنا لیا۔ اس نے وہ کام انجام دیا جو مغل کارنامہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ "توزک بابری" میں اس نے اپنی اور ہندوستان

Marfat.com

کی سچی تصویر کھینچی ہے جس کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں تبدیلی کیونکر ہوتی ہے۔ بابر کے آخری زمانہ میں ہندوستان نے اس کے دل میں جگہ کی اور اس کو یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ ملک نفرت کے قابل نہیں بلکہ اپنا ہو سکتا ہے۔ جیسے جیسے اس کی زندگی کے دن اس ملک میں بیتتے گئے ویسے ویسے وہ ہندوستان کی اصلیت اور خوبی سے مرعوب ہوتا گیا۔ بابر اور گورو نانک کی ملاقاتیں اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جو عزیز رکھا جا سکتا ہے۔ گورو نانک نے اس کو راج نیتی میں سبق دیئے، جہانگیری کے کھوکھلے مسلک کے راز کو فاش کیا اور یہ ہدایت کی کہ ملک گیری اور خوں ریزی انسان حکمرانوں کا طرۂ امتیاز نہیں ہو سکتا اور اگر وہ اور اس کا خاندان اس ملک پر حکومت کرنا چاہتے ہیں تو ملک والوں کے ساتھ انصاف اور محبت کے رشتہ کو جوڑنا ہوگا۔ روایت یہ بتاتی ہے کہ بابر گرو نانک سے بے حد مرعوب ہوا۔ ممکن ہے کہ ان ملاقاتوں کے نتیجہ کے طور پر بابر کے دل کی آنکھ کھلی ہو اور اس نے جو رویہ ملک والوں کے ساتھ اختیار کیا اس کی شہادت اس شاہی دستاویز میں موجود ہے جو ہمایوں کے نام بابر کی وصیت میں ملتی ہے۔ یہ وصیت ریاست بھوپال کے نواب صاحب کے کتب خانہ میں آج بھی موجود ہے اس وصیت کی اصلیت کے متعلق تحقیق کرنے والوں نے چھان بین

Marfat.com

کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ وصیت جعلی نہیں بلکہ اصلی ہے۔ اس وصیت کا گہرا مطالعہ بابر کی شخصیت کو نئے نقطۂ نظر سے جانچنے پر مجبور کرتا ہے۔ اگر اس وصیت کو اصل مانا جائے تو ہم یہ کہیں گے کہ بابر نے مغل حکومت کی داغ بیل انسانی اصولوں پر رکھی تھی اور اپنے آنے والے وارثوں کو ہدایت کے طور پر جہانبانی اور تہذیب کا ایک نیا راستہ بھی دکھایا تھا تاکہ مغل راج ایک نیا راج بن سکے۔ ہم اس نقطۂ نظر سے اس باب کے دوران میں مغل حکمرانوں کے کارناموں پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے اور بتائیں گے کہ ہر مغل حکمراں کسی نہ کسی اعتبار سے "بابری حکم" پر کاربند رہا۔ اگر یہ صحیح ہے کہ بابر نے یہ وصیت اس غرض سے چھوڑی کہ اس کا راج ایک مثالی راج ہو تو ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ بابر محض ایک سپاہی، ایک ادیب یا ایک فطرت پرست انسان ہی نہیں بلکہ ایک دور اندیش، سمجھدار، ذی فہم، روشن خیال مفکر بھی تھا۔

بابر کی وصیت ہمایوں کو جو ہدایت دیتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکمرانی کے معنی ایک من مانی راج کے نہیں بلکہ اس راج کے ہیں جس میں ایک ذمہ دارانہ شاہی فکر اور عمل کے لحاظ سے ہو۔ بابر کی نظر میں راج کرنے کے معنی وقتیہ راج کے نہیں بلکہ اس راج کے تھے جس میں ملک کی بھلائی، انسانوں کی خوشحالی، ملک کا امن و امان، کامل انصاف، عام دوا دادی اور دادرسی، ظلم سے حفاظت اور بچاؤ ہو۔

وہ راج ہو جس میں حاکم اور محکوم کا رشتہ تلوار کی بنا پہ نہ جُڑے بلکہ ان انسانی قوتوں پہ رکھا گیا ہو جن کی مدد سے ملک اور لوگوں میں امن اور خوش حالی، بھلائی اور نیکی پھل پھول سکے۔ حکمرانی سے متعلق یہ وہ ہدایت تھی جو بابر نے ہمایوں کو کی کیونکہ ایسے شاہی رویہ اور عمل سے حکومت میں پائیداری اور دیرپائی پیدا ہو سکے گی۔ ان تمام اصولِ حکمرانی کے علاوہ اس وصیت میں حکومت کی تعمیر کے سلسلہ میں ان تدبیروں کا بھی ذکر ہے جو ہمایوں کو اختیار کرنی ہوں گی اگر وہ ہندوستان میں مغلیہ راج قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس ضمن میں بابر لکھتا ہے کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مختلف نسل کے لوگ آباد ہیں اور جن کے مذہب الگ الگ ہیں۔ ان کی رسومات اور ریتیں بھی مختلف ہیں جن کی زندگیاں ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ ہندوستان مختلف قسم کی تہذیبوں اور سبھیتاؤں کا گہوارہ ہے۔ ایسے ہندوستان میں ایک حکومت کیوں کر کامیاب ہو سکتی ہے؟ یہ ایک سوال تھا جس کا جواب بالواسطہ بابر یوں دیتا ہے کہ ایسے ملک کو تلوار کے زور سے فتح کرنا آسان ہے لیکن ہندواسیوں کے دلوں پہ تلوار سے حکومت نہیں کی جا سکتی اور ایک نیا قانون اور ایک نیا رویّہ لاحق ہوتا ہے اور وہ انسانی سمجھ، رواداری اور ہمدردی کا ایک نیا راستہ ہی ہو سکتا ہے۔ اس انسانی نظر اور جذبہ کو اس نے اس طرح سمجھایا کہ ہندوستان دراصل ایک ایسا ملک ہے جس میں کائنات کی طرح مختلف موسمی عناصر موجود ہیں جیسے

Marfat.com

طرح قدرت میں موسمی عناصر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہوئے
اپنی ادا، اپنی فطرت اور بھاؤ، اپنی یکتائی اور اپج کاری کی نمائش کرتے
ہیں اور کائنات کے بنانے میں اپنا اپنا حصہ لیتے ہیں، اس طرح ہندستان
کے مختلف نسل، روپ اور مذہب کے لوگ کل ہندوستانی زندگی کے
الگ الگ پہلو کو ظاہر کرتے ہوئے اور اس حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں
کہ ہندوستان کے لوگ اور مذہب ہندوستانی زندگی کی بناوٹ
اور اٹھان میں اپنی اپنی ادائیں، اپنے اپنے رنگ، اپنا اپنا خیال،
اپنا اپنا انوکھا پن پیش کرتے ہیں اور اس طرح اپنی وحدت اور
یکتائی کو مجموعی طور پر کل ہندی زندگی میں کائنات کے موسمی عناصر
کے عجائبات کی طرح ہندی تہذیب اور سبھیتا کو جنم دیتے ہیں۔ بابر
کے اس خیال میں معاملات کے سمجھنے اور سلجھانے میں ایک کل ہندوستانی
زندگی کی حقیقت نظر آتی ہے۔ بابر کی نظروں میں ہندوستانی زندگی
ایک مبہم مظاہرہ نہیں بلکہ کائنات کی طرح وہ اپنے میں جیون بھرپور
قوت رکھتی ہے جس کی ترقی کی رفتار میں ظلم اور خلاف انسانی فعل
اور حرکت سے رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے مگر اس کی نشوونما نہیں ہو سکتی
اس کی ترقی کا راز اس میں مضمر ہے کہ انسانی اصولوں کو ملک کی عام
زندگی میں مقام حاصل ہو۔ اس طرح ہندوستان کی کل زندگی کی
ترقی کا سوال ایک سماجیاتی یا سبھیتا کا سوال بن جاتا ہے۔ ملک
کا ہر شخص اس وقت تک اپنی ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ ملک کی

عام ترقی کے ساتھ ساتھ اپنا قدم نہ اُٹھائے۔ ہر مذہب کل ہندستان کے ایک جز کی حیثیت سے یا ہندوستانی زندگی کی اتحادی قوتوں میں ضم ہونے کے بعد اس وقت تک ہندی اصلیت کو حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ کائنات کے کرشموں کی طرح جز اور کل آپس میں "فنا" نہ ہو جائے۔ اسی خیال کی مزید توضیح بابر نے یوں کی کہ ہندوستانی مختلف رسم و رواج اور طور و طریق کے پابند ہیں۔ اس لئے حکومت کو اس ہندوستانی زندگی کا لحاظ رکھنا بے حد ضروری ہے اور حاکم وقت کی دانشمندی اس میں ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی کو ہمدردانہ مگر غیر تعصبانہ نظر سے دیکھے اور اس بات کی کوشش کرے کہ اپنی زندگی کو کل ہندی زندگی میں ڈھالتے ہوئے اس تہذیبی فرق کو جو حاکم اور محکوم کے درمیان ہوتا ہے یگانگت اور ہم آہنگی کے جذبہ سے مٹا دے۔ اس عمل سے سماج میں راجا کی بدیسیت جو پرجا کے بیچ میں حائل ہوتی ہے وہ، ہو جاتی ہے، حاکم محکوم سے قریب تر ہو کر ملکی بن جاتا ہے اور ملکی سانچے میں ڈھلنے کے بعد ہی ملک کے لوگوں کی طبیعت، ذہنیت، مزاج، عادت اور طریقوں کو وہ صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے اور ملک میں ایک دیسی نما حکومت قائم کر سکتا ہے۔ رعایا کی زندگی پر شاہی کا ایسا طرز ایک خوشگوار ردعمل کا حامل ہوتا ہے جس کا نتیجہ سماج اور راجا کے ساتھ وہ وفاداریاں ہیں جو ملکی جذبوں اور خیالوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسی ضمن میں بابر نے

Marfat.com

اس امر کو بھی صاف کر دیا کہ ملک میں نفرت کی آگ کو نہ بھڑکایا جائے بلکہ اس طرح بجھایا جائے کہ حاکم پر عوام کے تعصبات اور توہمات کا پاس و لحاظ ہو۔ دوسرے لفظوں میں بابر یہ کہنا چاہتا ہے کہ باوجود ایسے تعصبات توہمات کے جو حاکم کی طبیعت کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ رعایا کے دل کو ٹھیس نہ لگے۔

اس وصیت میں بابر نے ہندوستانی زندگی کے ایک دوسرے پہلو کو بھی دکھایا ہے جس کا تعلق صرف ہندوستان کے مسلمانوں سے تھا۔ بابر کو یہ دیکھ کر بے حد افسوس ہوا کہ مسلمانوں کے آپسی میل جول اور اتحاد میں بے حد کمزوری اور خامی ہے۔ ان کی زندگی بھی فرقوں کی بندش میں جکڑی ہوئی ہے۔ وہ اسلام کے قانون کے پورے پابند نہیں ہیں۔ "توزک بابری" میں ایک جگہ یہ واضح کیا کہ ہندوستان کے مسلمان مسلمان نہیں ہیں اور قرآن اور رسولؐ کے احکام پر نہیں چلتے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی ایک وجہ ہندوستانی مسلمانوں کی بدعتی زندگی بھی تھی۔ اس وصیت میں بابر ہمایوں کو عام مسلمانی زندگی کی اسی خامی سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سنیوں اور شیعوں کی آپس کی دشمنائی جو ہندوستانی مسلمانی زندگی میں بھی نظر آئی اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ دونوں فرقے آپس میں رواداری اور دوستی نہ برتیں۔ ان میں تلوار کے زور سے محبت اور اتحاد پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں بابر نے مسلمانی عالمی زندگی کی ایک تاریخی اور سماجیاتی حقیقت کو پیش کر کے اپنے دل کے جلے پھپھولے پھوڑے ہیں

Marfat.com

ہمایوں کو اس بات کی تاکید کی گئی کہ جب ہندوستان کے تخت پر بیٹھے تو وہ مسلمانی زندگی کے اس عیب اور دھبے کو اس طرح مٹائے کہ خلش اور دشمنائی کی بجائے آپس کا اتحاد اور محبت قائم ہو سکے۔

اس وصیت کی آخری ہدایت اس بات پہ زور دیتی ہے کہ ایک حکمراں کے لئے لازم ہے کہ وہ تلوار کو حکمرانی کا شعار تصور نہ کرے۔ جب تک اس میں ایسا احساس پیدا نہ ہو کہ اس کا راج لوگوں کے دلوں پر حکومت کرنے کے لئے قائم ہوا ہے اس وقت تک تلوار کی حکومت کا دور دورہ رہے گا۔ یہ ایک مانا ہوا بنیادی سیاسی اصول ہے جس کی وضاحت بابر نے اپنی وصیت میں کی اور جس سے اس کا ایک سیاسی مفکر ہونا سمجھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ وصیت ایک سیاسی دستاویز یا سیاسی رہنما ہے۔ اس وصیت میں دو اصولوں کو مجموعی اعتبار سے پیش کیا گیا ہے۔

(۱) حکمراں کی تہذیب میں ملک کے حالات کا عمل دخل۔

(۲) راج اور جنتا کی بھلائی میں ملک کی ترقی۔

بابر کی وصیت پر اس کے بیٹے ہمایوں کو عمل پیرا ہونے کا کافی موقع نہ ملا، گو اس نے اپنے راج کے تھوڑے ہی زمانہ میں ہندوستانی رجواڑوں کے ساتھ نئے تعلقات کی بنا ڈالی۔ ہمایوں کی حکمرانی ایک اعتبار سے نئی نئی تجربوں کی حامل تھی۔ بحیثیت انسان کے اس کو

Marfat.com

کھوج لگانے کا بیحد شوق تھا۔ اس نے نئے نئے میدانوں میں ایجادیں کیں۔ وہ ایک اچھا خاصا عالم بھی تھا اور اس کو میکانی فن کاری سے بھی بیحد لگاؤ تھا۔ ہمایوں کو سیاسی انقلاب کی وجہ سے ایسا موقع نہ مل سکا کہ وہ اپنے باپ کی ہدایت پر پورے طور سے چل سکے۔ لہذا بابر کے بعد جس مغل حکمران نے بابر کی وصیت پر عمل کیا وہ اس کا پوتا اکبر اعظم تھا اکبر کا مرتبہ ہندوستان کی تاریخ میں ایسا ہی ہے جیسا کہ اشوک کو قدیم زمانہ میں حاصل ہوا تھا۔ ان دونوں کے مسلکوں میں ہم آہنگی اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ان دو نادر حکمرانوں نے اپنے اپنے منصوبوں اور نظریوں کے پورا کرنے میں مختلف تدبیریں اختیار کی تھیں۔ وہ ہندوستان کی سیاسی یکتائی کے علاوہ، اس کی کلچری یکتائی میں بھی مدد دیتی رہیں۔ ان دونوں کا مسلک ہندوستان کی یکتائی تھا۔ ایک بڑے ہندوستان (ہندوستان اعظم : GREATER INDIA) کے خیال کے مالک اشوک اور اکبر تھے۔ ان کے ذہن اور دل میں جس ہندوستان نے اپنا نقش جمایا تھا۔ وہ وہ ہندوستان تھا جو اتحادی قوتوں اور میل ملاپ کے جذبے سے بنا تھا اور جس کی اصلی قوت تلوار نہیں تھی بلکہ انسانی تعلقات کا کلچری اثاثہ تھا۔ ہندوستان کے علاقوں کو محض جیت کر، ان کو دبا کر، یا کچل کر، یا غلام بنا کر حکومت کرنا نہ اشوک کا اصول تھا اور نہ اکبر کا منصوبہ یا خواہش۔ ان دونوں نے ہندوستان کی دنیا میں انسانوں کے رشتوں کو پریم اور ہمدردی سے

Marfat.com

مضبوط کیا اور اس طرح سیاست کی بنیاد کلچر پر رکھی۔

اگر اکبر کا مقابلہ ہندوستان کے دوسرے مسلمان حکمرانوں سے کیا جائے تو یہ بات بالکل صاف طور سے واضح ہو جائے گی کہ جن سماجیاتی سلسلوں کی ابتداء ان کے دور حکومت میں مختلف جذبات اور خیالوں کے تحت ہوئی۔ ان کی تکمیل اکبر کے ہاتھوں ہوئی۔ خیالوں اور اصولوں کی وسعت، گہرائی اور بلندی میں اکبر ان تمام حکمرانوں سے سبقت لے گیا۔ یہ کہنا اور زیادہ صحیح ہوگا کہ اکبر نے اس سے قبل کے دور کے تعمیری اور اتحادی رجحانوں، کاوشوں اور جدوجہد کو وسیع تر کیا تاکہ ہندوستان کی تعمیر ہندوستان کی طبیعت کے موافق ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ اکبر نے وسطائی ہندوستان کی زندگی کی خامیوں اور قدامت پسندیوں کو دور کرکے ایک نیا صلح کل ہندوستان کھڑا کیا۔ اکبر خود صلح کل انسان تھا اور اس نے صلح کل نظریوں اور اصولوں کو عام ملکی زندگی میں ایسا سمویا کہ مغلیہ دور اکبری اثر کا رہین منت تھا۔ اکبری صلح کل اصول پر امن زندگی کا ایک اہم ترین ترقی پسند اصول ہے جو اپنے میں ان گنت تعمیری قوتیں رکھتا ہے۔ اسی خیال سے اکبر متاثر ہوا تھا اور اس کی زندگی کی کوششیں یہی تھیں کہ ہندوستان امن کے تعمیری اور ملواں قوتوں کی اہمیت کو سمجھے اور ان پر چلے۔ اکبر خوب جانتا تھا کہ امن اپنے دائرہ کے پھیلاؤ کو ملک میں اس وقت تک ترقی نہیں دے سکتا جب تک کہ ہندو اسی اپنی زندگی میں اس کا اثر

نہ لے لیں۔ اس لحاظ سے امن محض ایک لفظ نہ تھا بلکہ وہ خود کل زندگی کی ایک قوت ہے یا زندگی کے وہ دل کش روپ ہیں جو انسان کو آپس میں میل ملاپ کے رشتے میں جکڑ کر اپنی اپنی یکتائیوں کو بحال رکھتے ہیں۔

ویسے تو صلح کل کا اصول اس زمانہ کے ہندوستان کے لئے ناممکن تھا لیکن اس دنیا کی تخریبی قوتوں کو اگر بے دم کیا جا سکتا تھا اور عام زندگی میں نیا جوش اور نئی امنگ پیدا کی جا سکتی تھی تو وہ وہی امن کا صلح کل اصول ہو سکتا تھا جو اکبر اعظم نے ہندواسیوں کو دیا۔ اکبر گو ایک شُدھ بُدھ پڑھا لکھا انسان تھا (کہا یہ بھی جاتا ہے کہ وہ اَن پڑھ تھا) لیکن باوجود اس کم علمی کے وہ ایک ایسا روشن خیال انسان تھا جس کی نظر زندگی کی اصلیت پر پڑتی تھی اور اس کے دھوکے اور فریب کو چاک کر دیتی تھی۔ یہ اکبر کی فطری صلاحیت تھی۔ جیسے جیسے اس کی طبیعت میں صلح کل کا قانون جگہ کرتا گیا ویسے ویسے اس کی چھپی ہوئی شخصیت اُبھرتی گئی اور اپنے انسانی کمال کے جوہر دکھانے لگی۔ اکبر کی بڑائی اور اس کی عظمت اسی انسانی ترقی کے کرشمہ میں تھی جس کے اثر میں زمانہ اور لوگ آئے۔ غور و فکر کے بعد اکبر اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہندوستان ایک بہت ہی پُرانا ملک ہے جہاں کے باشندے پرانے طرز کے ہیں وہ رسم و رواج میں پُرانے ہی نہیں بلکہ عادتوں اور خیالوں میں بھی پُرانے ہیں۔ ان کے دل و دماغ کی ساخت اور بناوٹ بھی ٹھیٹ

Marfat.com

قدامت پسندانہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ ہندوستان کے لوگ مختلف مذہب و نسل کے ہیں۔ ان کے سانچے اور کسوٹیاں بھی الگ الگ ہیں یعنی لوگوں کے مذہبی، اخلاقی، سماجی یا سماجیاتی زندگی کے اصول بھی مختلف ہیں۔ دوسری طرف ہندوستان کی سیاسی دنیا میں چھوٹی چھوٹی اور بڑی بڑی حکمرانیاں بھی تھیں جو ایک دوسرے سے ٹکرایا کرتی تھیں۔ بعض مرتبہ تو وہ آزمایش میں کامیاب ہوتی تھیں اور کبھی ناکام بھی۔ ہر راج چھوٹا یا بڑا ایک دوسرے کے زور کو توڑنے یا بیجا فائدہ اٹھانے پہ تلا ہوا تھا۔ اس قسم کی سیاسی بے چینی اور جھگڑے ہندوستانی زندگی کے امن میں حائل ہو رہے تھے اور کل ہند سیاسی مرکز کے لئے خطرہ کا باعث تھے۔ ان رجواڑوں کی سیاسی کوتاہ نظری، چاپلوسی مقامی وفاداریاں یا نمک حلالیاں اور سیاسی اغراض ہندوستان کو ایک مضبوط سیاسی مرکز بنانے میں ہمیشہ رکاوٹ بنتے رہے۔ یہ ایسا سوال تھا جس سے اکبر کو دوچار ہونا پڑا۔ جب تک کہ ان دو مسئلوں کا حل دریافت نہ ہو جائے اس وقت تک مغل حکومت یا راج اکبری نقطۂ نظر سے کامیاب نہ ہو سکے گا۔ اکبر نے ان سیاسی مسئلوں کے حل میں صلح کل کے اصول کو بہت ضروری سمجھا۔

ہندواسیوں کی زندگی میں صلح کل کے فلسفہ کی اہمیت اس طرح واضح کی گئی کہ امن انسانی ترقی کی جان ہے۔ وہ محض ایک مردہ خیال یا وہم نہیں بلکہ وہ قوت ہے جو حرکت میں آنے کے بعد انسان کے دل و دماغ

میں انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اکبر کا یہ خیال کہ ہندوستانی زندگی انقلاب کے جھٹکوں کو محسوس کئے بغیر امن کی قوت سے ترقی کر کے راستہ پر لگ جائے گی۔ ایک سادہ مگر پُر اثر اصول تھا کیونکہ اس کا وجود ہندوستان جیسے بڑے ملک کے لئے ناگزیر تھا۔ اگر انسان صلح کل کے فلسفہ کی اہمیت کو نہیں سمجھتا تو وہ اپنی زندگی کی اہمیت کو بھی نہیں سمجھتا کیونکہ انسانی زندگی کا اُٹھاؤ، بڑھاؤ اور ابھار دراصل برباد کرنے والی قوتوں سے نہیں ہوتا۔ انسان، سماج اور ملک یہ سب کے سب اسی وقت انسانی قوتوں کو ترقی دے کر اپنے میں میل ملاپ اور رواداری کے اصولوں کو جگہ دے سکتے ہیں جب کہ صلح کل کا فلسفہ عملی جامہ نہ پہنے۔ اکبر اسی نظریہ کا حامل تھا۔ ہندوستان کی اَن گنت جاتیوں اور طبقوں کو کلچری یکتائی کے رنگ میں رنگنے کی کوشش صلح کل کے پیام کی آواز تھی۔ ہندوستان کے مختلف کلچری نظام میں لانے کے معنی یہ تھے کہ عام ملکی زندگی امن پسند کیفیتوں کو پیش کرے گی۔ جھگڑے اور فساد، نفاق اور دشمنی، فرق اور امتیاز سے ہٹ کر مغل دور میں اس صلح کل اصول کا عملی اثر جو دکھائی دیا وہ ہندی مغل خیال اور زندگی کی ایک زندہ مثال ہے۔ ہندوستانی زندگی کے روپ اور اس کی ادائیں، اس کے طریقے، اس کی طرحیں، اس کی نزاکتیں، مغلوں کی نمایاں خصوصیت بن گئیں اسی کے ساتھ ساتھ عام ملکی زندگی پر ایک مغل تہذیب کا چوبہ بھی چڑھنے لگا۔ اس طرح مغل حاکم اور ہندی محکوم دونوں میں یگانگت

Marfat.com

پیدا ہوئی اور اتحادی قومیں ترقی پسند نقطۂ نظر سے پھیلتی ہوئی ملک کی زندگی کو متاثر کرنے لگیں۔

اکبر نے صلح کل پیام کی دعوت ہندو اسیوں کو دی۔ وہ ایک نئی ہندی زندگی تھی جس کی تعمیر سمجھ اور فہم، ہمدردی اور رواداری کے اصول پر تھی۔ اس لحاظ سے اکبر نے بابر کی وصیت کے "خیال" کو ہندوستانی انسان کی جیتی جاگتی زندگی میں عمل سے بدل دیا۔ اکبر اس بات کو خوب سمجھ چکا تھا کہ انسانی یکتائی کی جڑ، اصل صلح کل زندگی کا اصول ہے۔ انسان جو نسلوں، رنگوں یا مذہبوں کی تقسیم میں یقین رکھتا ہے وہ نہ صرف اس خیال کو سمجھ ہی نہیں کرتا بلکہ اس کو بے دم بھی کر دیتا ہے۔ وہ انسانی ارتقاء کے قانون کو بھی نہیں سمجھتا۔ دنیا میں انسانی روپ مختلف نظر آتے ہیں لیکن انسان کی اصلیت ہر جگہ ایک ہے۔ انسانی طریقے، عادتیں رسم و رواج، ریتیں اور رویے ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتے ہیں لیکن ان سب کے پیچھے ایک ہی انسان کی ذات اور اس کا قانون کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اسی خیال کو بابر نے اپنی وصیت میں کائنات اور انسان کی ہم آہنگی کے قانون میں واضح کیا تھا جس کو اکبر نے اپنے زمانہ میں صلح کل کے قانون سے تعبیر کیا تھا۔ اس نے انسانوں کے فرق کو نہ مانتے ہوئے اس دعویٰ کو پیش کیا کہ تمام انسان ایک ہیں اور مذہبوں کی ظاہری تقسیم میں ایک ہی عالمگیر مذہب کا قانون کام کرتا ہے انسانی قانون سے اونچا اور اتم کوئی دوسرا قانون نہیں ہے۔ اکبر کی

Marfat.com

کل سمجھ اور نظر میں انسانی قانون کی ترقی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ انسان اپنی پنہاں قوتوں سے آگاہ ہو جائے اور وہ اس بات کے درپے ہو کہ ان کی پرداخت کر سکے۔ سوائے اس کے اکبر اعظم کا زاویۂ نظر کچھ نہ تھا کہ انسان کو سماجوں اور مذہبوں کے جھوٹے فرق بتائے اور انسانی برادری کے اصولوں پر انسان کی سماجی زندگی کی تشکیل ہو۔ انسانی اتحاد اور یکجائی کا سوال محض انسان کی قوت اور اس کی سوجھ اور سمجھ پر اتنا منحصر نہیں جتنا کہ سماجیاتی قوتوں کے میل ملاپ پر ہے۔ انسان کی تہذیبی ترقی اسی راستے سے ہو سکتی ہے بشرطیکہ سماج اور مذہب کے عالمگیر اصول کا دور دورہ ہو، ورنہ مذہب اور سماج کے امتیازی اصولوں سے انسان اور انسان میں جو فرق پیدا ہوتا ہے وہ پاٹا نہیں جا سکتا۔

اکبر ایک سچے مذہب کا ماننے والا تھا جس کے دل میں صداقت اور حق کی آگ لگی ہوئی تھی۔ گو زمانہ کی تاریخ لکھنے والوں نے اس کو بے دین بتایا ہے (مذہبی کوتاہ نظری اور تعصب کے اعتبار سے وہ ضرور لامذہب تھا) لیکن اکبر کی جانچ اگر اس معیار سے کی جائے جو دنیا کے بڑے دھرم ویروں نے سچے مذہب کے پانے میں کیں تو اس کو بھی وہی مرتبہ حاصل ہوگا جو سچے مذہب کے راستے پر چلنے والوں کو ملا۔ اکبر نے مذہب کی صداقت کی جستجو میں عقل اور سمجھ کو دخل دیتے ہوئے اصلی مذہب کو دل کی آنکھ سے دیکھا اور پایا۔ اس زمانہ کے

Marfat.com

مولوی اور قاضی اکبر کی تلاش حق کی جستجو کے مفہوم کو نہ سمجھے۔ ان کے نزدیک مذہب کے معنی صرف "کتابی مذہب" کے ہو سکتے تھے۔ یہ وہ کتابی مذہب ہے جس سے انسان کے دل میں تنگ نظری، تعصب، فرقہ واریت، پھوٹ اور نفاق پیدا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اکبر کی لڑائی مولویوں اور قاضیوں سے رہی اور ان ہی لوگوں نے اکبر کو بدنام کیا۔ مناظرے سچے مذہب کی اصلی کھوج کے سلسلہ میں اکبر کروایا کرتا تھا وہ اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ اس کا مقصد یہ نہ تھا کہ وہ دیکھے کہ کس فرقہ کی جیت ہو کس کی ہار، بلکہ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ دنیا کے مذہب انسان کو کس طرح ایک راہ پر لگا سکتے ہیں۔ جیسے جیسے مناظروں کی گرما گرمی اور بحث و تکرار کے جوش میں پنڈت اور مولوی اپنے کٹرپن کو ظاہر کرتے جاتے تھے ویسے ہی اس نے ایک مرتبہ بحث و مباحثہ کے دوران میں مذہب کے عالموں سے ایک سوال کیا کہ کیا خدا کا تصور انسان کے ساتھ پیدا ہوا اور کیا ایمان اس کا نتیجہ ہے؟ جواب میں یہ کہا گیا کہ ایسا ہی ہے۔ اکبر نے اس خیال کی تردید یوں کی کہ انسان خدا کے تخیل کو پیدا کرتا ہے نہ کہ وہ انسان کے ساتھ جنم لیتا ہے۔ اس خیال کی تصدیق اس نے ایک تجربہ کے ذریعہ اس طرح کی کہ ایک قلعہ میں بہت ہی کم عمر کے پانچ بچوں کو بند کروا دیا اور حکم دیا کہ ان کی جان کی حفاظت کی جائے لیکن ان سے کسی قسم کی بات چیت نہ کی جائے۔ پانچ سال کے بعد یہ بچے دربار میں لائے گئے اور اکبر نے مذہبی عالموں کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ ان سے

Marfat.com

دریافت کرو کہ خدا کیا ہے؟ یہ انسانوں کے بچے نہ کوئی بولی سمجھتے تھے اور نہ کوئی زبان بولتے تھے۔ وہ آدھے وحشی تھے۔ ان کے پاس نہ خدا کا تصور تھا اور نہ سماج کا لحاظ اور خیال۔ وہ دراصل جانور تھے۔ اس تجربہ سے اس نے یہ ظاہر کیا کہ خدا پر ایمان لانا اختیاری ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا تجربہ تھا جس سے اکبر کے اصلی مذہب کی راہ پر دلی اور ذہنی کاوشوں کا اندازہ لگتا ہے۔

اکبر عبادت خانے میں جہاں مذہبی دنیا کے لوگ اکٹھا کئے جاتے تھے ایک تحقیقی فضا صلح کل اصولوں پر پیدا کرنا چاہتا تھا تاکہ ایک مذہبی فرقہ دوسرے مذہبی فرقے کو رواداری اور انسانی نظر سے دیکھے اور سمجھے کیونکہ مذہبی دنیاؤں کا اتحاد در اصل انسانی اتحاد کا پیش خیمہ ہے۔ یہی نظریہ اکبر کا تھا، لیکن اس کو یہ دیکھ کر بیحد رنج ہوتا تھا کہ مذہب جو دنیا میں زندگی کے امن کو قائم کرنے آیا ہے وہی زندگی کی امن پسند بنیادوں کو کھوکھلا کر کے برباد کر رہا ہے۔ اکبر کا صلح کل سند یہ ایک پر امن مذہب کا اصول تھا جو انسانوں کی برادریوں کو آپس میں محبت اور اتحاد کے رشتہ میں جوڑتا ہے۔

اکبر کا "دین الٰہی" صلح کل اصول کا لازمی نتیجہ تھا۔ وہ مذہبوں کے نچوڑ یا ان کے اصل کی تلاش میں انسانی جستجو کی ایک زندہ نظیر تھی۔ عام خیال ہے کہ اکبر نے دین الٰہی کے ذریعہ ایک نیا مذہب قائم کیا۔ "دین الٰہی" اس اعتبار سے نیا مذہب تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ مختلف

Marfat.com

مذہبوں کا مجموعہ تھا۔ اکبر تمام مذہبوں کی اصل کو ایک مانتا تھا۔ اس لئے اس نے ان کے موٹے موٹے اصولوں کو دین الٰہی میں جمع کیا تاکہ انسان مذہبوں کی ظاہر پرستیوں کے فرق کو بھول کر اصلی مذہب کے اتحادی اصولوں پر یقین لائے اور اپنی زندگی کو رواداری اور یگانگت کا نمونہ بنائے۔ یہ صحیح ہے کہ اکبر کا دین الٰہی دھرم کی حیثیت سے پھیل نہ سکا لیکن جس جذبہ کے تحت اس نے اکبر کے دل و دماغ میں جنم لیا وہ مذہب کا کوئی انوکھا روپ نہ تھا بلکہ مذہبی جستجو کی اسپرٹ تھی جو سچائی اور حق کے راستہ پر کھوج لگا رہی تھی۔ "دین الٰہی" اکبری امن پسند ذہنیت اور خیال کی پیداوار تھی۔ گو "دین الٰہی" عام نہ ہو سکا لیکن اکبر کی کلچری زندگی میں اس کا نمایاں حصہ تھا۔ اس نے عملی طور پر اپنی زندگی میں اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ مذہبی دنیا کا ایک سچا نمائندہ ہے جو ہر مذہب کے اصول اور عقیدے کو اپنی زندگی کا جزو قرار دیتا تھا۔ اس کی زندگی مذہبوں کے احکام کی مرکز تھی۔ دوسرے لفظوں میں اکبری شاہی انسانوں کی مختلف برادریوں کو اپنانے میں کامیاب ہوئی۔ غیریت اور اپنائیت کے فرق کو جو حاکم اور محکوم یا راجا اور رعایا میں نسل، مذہب اور تہذیب کی وجہ سے پیدا ہوا تھا اکبر نے اپنے صلح کل اصول سے مٹا دیا۔ جس طرح اشوک نے ایک کلچری راج انسانی اصولوں پر قائم کیا تھا ویسا ہی اکبر نے بھی ایک راج قائم کیا۔ لہٰذا عہد وسطیٰ میں اشوک نے دوبارہ اکبر کی ہستی میں جنم لے کر پرانے ہندوستان کو

نئے روپ میں ڈھالا۔ اکبر کا سب سے اہم ترین کارنامہ ہندوستان کی تاریخ میں یہی تھا۔

اکبر کا کلچری مشن محض انسان اور سماج کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ اس کا اثر راج نیتی پر بھی پڑا۔ ایک سماج سیوک کی حیثیت میں اس کی راج نیتی بھی نرالی تھی۔ وہ محض فوجی مہموں پہ مبنی نہ تھی۔ جس طرح کلچری یکتائی کے مسلک کو اس نے پورا کیا اسی طرح وہ سیاسی یکتائی کے منصوبہ میں بھی پورا اترا۔ سیاسی یکتائی اس وقت تک اپنی مکمل شکل کو نہیں نکھار سکے گی جب تک کہ ملک کے سیاسی حصے یا قومیں ایک نئے عالمگیر جہانبانی کے رشتے میں منسلک نہ ہوں۔ سیاسی یکتائی کا سوال محض انتظامی حکمرانی کا نہیں بلکہ کلچر کا ہے۔ راج نیتی اور کلچر کے آپس کے تعلق کو راج کی ترقی کے لیے لازم سمجھیں۔ اکبر کا ہندوستان اعظم ان ہی اصولوں کے لگ بھگ بنایا گیا تھا۔ ہندوستان اعظم اکبر کی نگاہ میں صرف ایک خیالی دنیا نہیں تھی بلکہ اس کو وہ حقیقت سمجھتا تھا کیونکہ ہندوستان کی دیسی ریاستوں کے سنگھٹن کو ایک مرکز پر لانے کے لیے نئی فضا کی ضرورت تھی۔ وہ اپنی مقامی ملکی تاریخ، روایات اور دستور کو فخر کی نظر سے دیکھتے اور ہندوستان اعظم کی بڑھتی ہوئی قوتوں میں رکاوٹ بنتے تھے۔ رجواڑوں میں مرکزی ہم آہنگی اور سنگھٹن کا خیال اور بھاؤ مطلق نہیں تھا۔ اکبر کی یہ کوششیں کہ دیسی رجواڑوں کے ساتھ گہرے اور دیرپا سمبندھ پیدا کیے جائیں ہندوستان اعظم

کے مسلک کو قریب تر لانے میں مدد دیتا ہے۔ ہندوستانی رجواڑی
قوتوں کو یکجا کیے بغیر ہندوستان کو ہندوستان اعظم نہیں بنایا جا سکتا
اور اس کی ترقی کے راستہ میں رکاوٹوں کے معنی یہ ہوں گے کہ ہندوستان
ہمیشہ کے لیے ایک جھگڑوں کا گھر رہے گا۔ اکبر نے ان رجواڑی بندھنو
کو انسانی اتحاد اور محبت کے قانون سے جوڑا نہ کہ راج کاری کے جبری
قانون سے۔ اکبر کے رجواڑی شادی بیاہ کے رشتے اس مسلک کی
طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس کلچری میل ملاپ کا اثر اس طرح ظاہر ہوا
کہ تھوڑے ہی عرصہ میں رجواڑے اپنی زندگی میں تبدیلی محسوس
کرنے لگے اور ان پر مغلی ہندی جذبہ اور ذہنیت کا چربہ چڑھنے
لگا۔ اس آپسی میل ملاپ سے یہ نتیجہ نکلا کہ مغلوں کے دل و دماغ
پر رجواڑی زندگی کا اثر نظر آنے لگا۔ ہندوستان کی تاریخ کا ایک
ایسا زمانہ تھا جب کہ ملک کی کلچری قوتوں کے میل سے ایک ملوان
امن پھیلانے والی تہذیب پیدا ہوئی۔ اس راج نیتک اور کلچری
میل جول، اتحاد اور سمجھوتہ کے بڑھانے اور پھیلانے میں رجواڑی
قوتوں نے خوشی سے ہاتھ بٹایا۔ اکبر سے لے کر اورنگ زیب تک
فوجیں رجواڑی کمان کے تحت مغلوں کے لیے وفاداری سے
لڑیں جس کی شہادت ہمیں اس زمانہ کی تاریخ میں ملتی ہے۔ راجپوتی
فوجوں کی بھرتی کا سلسلہ اکبر سے اٹھا جو اورنگ زیب کے عہد تک
بڑھتا گیا۔ یہاں اس امر کا ذکر کر دینا بے حد مناسب ہے کہ مغلوں سے

Marfat.com

پہلے بھی مسلمان حکمرانوں کے زمانہ میں تقریباً جتنی بھی لڑائیاں ہوئیں وہ محض مسلمان فوجوں اور ہندی فوجوں کی آپس کی مڈبھیڑیں نہیں تھیں۔ مسلمان حکمرانوں کے ساتھ ملکی ہندی رجواڑوں کی ہندی اور مسلمان ملواں فوجیں جو تھیں وہ ہندی یا مسلمان رجواڑوں کے خلاف ڈٹ کر لڑیں۔ مسلمانی حکومت کے استحکام میں ہندی فوجوں کی قربانی اور وفاداری اسی طرح مسلم ہے جس طرح کہ مسلم فوجوں کی تھی۔ جیسے جیسے مسلمانی راج میں پائیداری پیدا ہوتی گئی ویسے ویسے ملواں فوجیں حکومت کی خصوصیت بنتی گئیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں شاید ہی ایسی مثالیں ملیں جہاں مسلمان اور ہندی دو گروہ یا لوگ ہو کر ایک دوسرے کے خلاف لڑے ہوں۔ ہندو مسلمان فوجوں کی ہار اور جیت دراصل حکومت کی ہار اور جیت کا سوال تھا۔ مسلمان حکمراں ہندوؤں کو کمان سپرد کرنے میں بھی پیچھے نہیں رہے۔ مسلمان حکومت نے جو لڑائیاں ملواں فوجوں سے ہندو یا مسلمان حکومتوں کے خلاف لڑیں وہ مذہبی جذبے کے تحت نہیں ہوئیں۔ وہ لڑائیاں دراصل ملک گیری کی ہوس میں ہوئیں یعنی مسلمان مسلمان حکمرانوں کے درمیان یا مسلمان اور ہندو حکمرانوں کے درمیان سیاسی لڑائیاں ہوتی رہیں تاکہ ملک پر اپنا قبضہ ہو۔ ایک عالمگیر اسلامی راج کے قیام کے منصوبے نہ چھوٹے مسلمان حکمرانوں کے پیش نظر تھے اور نہ بڑے حکمرانوں میں پائے گئے تھے، بلکہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ

Marfat.com

بڑی مسلمان سیاسی قوتیں چھوٹی مسلمان حکومتوں کو برباد کرنے پہ تلی ہوئی تھیں۔ ان سیاست کاریوں میں نہ اسلام کی جھلک تھی نہ دین کی سیوا کا خیال، نہ اسلامی برادری کا جذبہ اور نہ "امت" کو مضبوط بنانے کی کوشش۔ لڑائیوں کے ڈھنگ اور طریقوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ملک کے حصوں کو ایک طاقتور حکومت کے تحت لایا جائے۔ یہ تھیں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی نام نہاد اسلامی "خدمات" اور "کارگزاریاں" ایسے ہی واقعات مغل زمانہ میں بھی دہرائے گئے جہاں عام فوجی بھرتی میں مذہبی عنصر کا دخل نہ تھا بلکہ جس بات کا پاس اور لحاظ تھا وہ طبقوں کی نمک حلالی اور وفاداری تھی۔

اکبری دور سے سیاسی رجحانوں کے ذریعہ کھوئی ہوئی کچہری زندگی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے کیونکہ راج کے سامنے انسان کے مرتبہ کی جانچ میں اس کا مذہب کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اکبری دور میں حکومت کی بنیاد غیر دھارمک اصول پہ رکھ کر اس فرق کو دور کیا جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان جذیہ کی وجہ سے پیدا ہو رہا تھا اور مہرش کا ایمان یا دھرم اس کا اختیاری فعل تھا اور حکومت کا دباؤ اس کے مذہبی عقیدہ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا تھا۔ اس زمانہ کی دنیا کے لئے مذہبی آزادی کا خیال ایک حیرت کی بات تھی۔ اکبر کی تعلیمات کا نچوڑ (جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں) عام زندگی کو امن پسند اصولوں پر چلانا تھا۔ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ زندگی کا امن پسند اصول

اس وقت تک اپنے مقصد کو نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ انسان کو مذہبی و چارہ اور عمل میں آزادی نہ ہو۔ مذہبی آزادی پیش خیمہ ہے انسانی زندگی کے ایک پہلو کی ترقی کا۔ ایسا ممکن ہے کہ اکبر بھی انہی خیالوں اور جذبوں سے متاثر ہو کر کل مذہبی آزادی کا پرچارک بنا۔ راج پاٹ کو مذہبی دباؤ اور اثر سے آزاد ہی نہیں کیا بلکہ یہ ظاہر کیا کہ راج پاٹ کا تعلق سرکار سے اور مذہب کا انسانوں کے دل سے۔ لیکن مذہبی آزادی کی حفاظت کا سوال سرکار کا سوال ہے کیونکہ انسانوں کو بلا روک ٹوک مذہب پہ چلنے کی آزادی سرکار کی حفاظت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے اس لحاظ سے جس راج کی عمارت اکبر نے تیار کر کے کھڑی کی تھی اس کی بنیادوں میں نہ مذہب کا قانون تھا اور نہ مذہب کا عنصر۔ وہ بالکل غیر مذہب تھی یا مذہب سے آزاد۔ اس ضمن میں اگر یہ کہا جائے کہ اکبری راج کلچری مگر غیر دینی اصولوں پہ قائم تھا تو غلط نہ ہوگا۔

مغل عہد کا دوسرا دور جہانگیر کے راج سے شروع ہوتا ہے۔ جہانگیر اپنے باپ اکبر کے قدم چلا اس طرح چلا کہ جو مقبولیت اور ترقی اکبری اصولوں کو حاصل ہو چکی تھی ان میں رخنہ اندازی اور کاوٹ کی بجائے اور زیادہ ترقی تیزی سے ہونے لگی۔ جہانگیر نے "توزک جہانگیری" میں اپنی کل ہستی کے مختلف روپوں کو پیش ہی نہیں کیا بلکہ ایسے خوش عقیدہ کا اظہار کیا کہ وہ اپنے باپ کے اعلیٰ اصولوں کا حامل دکھائی دیا۔ اس لحاظ سے جہانگیر کا دور اکبری عہد کے سلسلہ کی کڑی ہے جو اس کے

Marfat.com

ہاتھوں مضبوط ہوئی۔ جہانگیری دور کی پکار جو دنیا نے سُنی وہ انصاف کی پکار تھی۔ انصاف جہانگیری نقطۂ نظر سے ایک ایسا انسانی اصول ہے جو زندگی کے امن کی دھاروں کو ایک سنگم پر لاتا ہے۔ انصاف پُرامن زندگی کی جان ہے۔ اکبری عہد میں صلح کُل مسلک کو جو پھیلاؤ نصیب ہوا اسے جہانگیری عہد میں گہرائی حاصل ہوئی۔ جہانگیری انصاف ایک محدود دائرہ میں نہیں پنپا بلکہ وہ ایک جہانی قوت کی حیثیت میں ہر انسان کی حفاظت کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس کا تعلق کسی جماعت، کسی فرقہ، کسی ذات اور کسی مذہب سے نہ تھا۔ جہانگیری انصاف دراصل انسانوں کے ساتھ بلا لحاظ رنگ و روپ اور مذہب ایک غیر دینی اور غیر سیاسی انصاف تھا۔ وہ ایک قانون تھا جو انسان کے دل میں انسان کے ساتھ انصاف کے لیے پیدا ہوا تھا۔ اس کا مسلک انسانی تھا یعنی انسانی حفاظت، انسانی ترقی اور انسانی حق۔ جہانگیر کی شخصیت کا مطالعہ اگر گہری نظر سے کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ایک بہت بڑا انسان تھا اور اس کی زندگی کی اچھائیاں اور بُرائیاں جو اس میں مرتے دم تک تھیں، انسانی قانون کی آواز کو بلند کرنے میں کامیاب ہوئی۔ مغل حکمرانوں کی شخصیتوں میں جو انسانی قوتیں بھری پڑی تھیں ان میں سے جہانگیر کی شخصیت کو سب سے زیادہ امتیاز بحیثیت ایک انسان کے حاصل ہوا۔ اس کی تمام دلچسپیاں چاہے وہ علمی ہوں یا مذہبی یا سائنسی ہوں یا نیچری یا فن و ہنر کی ہوں یہ

Marfat.com

ظاہر کرتی ہیں کہ جہانگیری انسان نے جیسے جیسے ترقی کی ویسے ویسے اس کے کاموں میں حق کی تلاش کی امنگوں سے ایک دلکش تیکھک، ایک نیچر کا پریمی، ایک سائنیس داں، ایک عشرت پسند گزندہ انسان ایک فن داں اور ایک انصاف پسند بادشاہ پیدا ہوا۔

شاہجہانی راج مغل عہد کی شان وشوکت تھی۔ گو شاہجہاں کے دور میں اکبری اور جہانگیری ریتیں اور روایتیں ترقی پر تھیں لیکن وہ دور اپنی نوعیت کے اعتبار سے شاہجہانی مسلک کا نمونہ تھا۔ شاہجہاں کی مہذب ہستی کی کلچری قوتوں کو ابھارنے کے لیے اس کی طبیعت میں نزاکت اور رنگینیت پیدا ہی نہیں کی بلکہ اس کے راج پر اپنی چھاپ ڈال دی۔ ہندی زندگی کا ہر شعبہ شاہی صفتوں میں رنگ گیا۔ کل ملک میں نیا شاہجہانی رنگ چڑھنے لگا۔ شاہجہاں کا زمانہ دراصل مغل عروج کا زمانہ تھا جس میں سیاسی، سرکاری، اخلاقی سماجی، صنعتی اور فنی ترقی اپنے آخری منزل کو پہنچی اور مغل شیرازے کے تانے بانے مضبوط کرائے گئے۔ شاہجہانی ہندوستان پر ایرانیت کا چربہ اس طرح چڑھا کہ عام زندگی کے تہذیبی معیاروں اور اظہاروں میں شاہجہانی جھلک نمودار ہوئی۔ شائستگی اور فنیت کے پرچار کی وجہ سے انسان کی زندگی میں جمالیاتی اور خوشگوار اثرات ظاہر ہوئے۔ شاہجہاں کی فنی یادگاریں یہ بتاتی ہیں کہ کلچر اور آرٹ کا میل نقطۂ کمال کو پہنچ گیا تھا جس کے باعث ہندوستان کی شہرت

Marfat.com

دنیا میں ہوئی۔ فنی اور کلچری قوتیں محض انسانی تخیل اور فکر کی نظریں نہیں ہیں بلکہ زندگی کے مختلف ملواں معوپ کے مظاہرے ہیں۔ اس لحاظ سے شاہجہانی راج ایک زندہ سماجیاتی پس منظر میں اپنے نفسیاتی، جمالیاتی اور تہذیبی مسلک کو پورا کرتا ہے۔ شاہجہانی مسلک کی کامیابی کا بھید ہندوستانی دنیا کی قوتیں تھیں۔ ہندوستان کے سینکڑوں برسوں کی تہذیبی روایات اور فنی تجربہ کاریاں شاہجہاں کے کے کام آئیں۔ شاہجہاں کا تہذیبی اور فنی مسلک اس وجہ سے پورا اترا کہ اس نے ملک کی سمجھ، فکر اور عمل کے ذخیرہ سے استفادہ کیا۔ اس طرح شاہجہانی ہندوستان "بابری حکم" کے مطابق تہذیبی اور جمالیاتی ترقی کرتا ہے۔

کلچر اور آرٹ اسی ملک میں پروان چڑھ سکتے ہیں جہاں امن کے ساتھ انسان خوشحال اور اطمینان بخش زندگی بسر کرتے ہوں۔ شاہجہانی دور میں یہی نہیں ہوا کہ دہلی ایک کل ہند کلچر اور آرٹ کا مرکز بنا بلکہ ہندوستان کے ہر حصہ میں جہاں جہاں تہذیب اور آرٹ کا دور دورہ رہا ترقیاں دکھائی دیتی تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ مرکز نے ان رجحانوں کو ایک وسیع پیمانہ پر اور اعلیٰ معیار تک پہنچایا۔ مغل شہادتیں اس بات کا ثبوت دیتی ہیں کہ ملک میں اشیا کی افراط تھی، لوگ آسانی سے اپنی ضرورتوں کو پورا کر سکتے تھے اور ضرورت کی تمام چیزیں سستی تھیں۔ عام زندگی کے لوازمات آسانی کے ساتھ فراہم

Marfat.com

ہو جاتے تھے، مغل دور کا تیسرا پہلو غیر مغلی تہذیب کا مرکز بنا کیونکہ اس زمانہ میں مغلوں کے کچھ ری روایات جو تیزی سے ملک میں پھیل رہے تھے اور جن کی وجہ سے ہندوستان کی عام زندگی میں تبدیلی بھی ہو رہی تھی اس کے خلاف ایک بدنما ردعمل پیدا ہوتا ہوا نظر آیا۔ وہ خلاف مغلیہ ردعمل ہے جو اورنگ زیب کے دور حکومت سے شروع ہوا۔ اورنگ زیب کے راج کے متعلق تاریخ لکھنے والوں نے دو ایسے نظریوں کو پیش کیا ہے جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ہندی اسکول کا کہنا یہ ہے کہ اورنگ زیب ایک متعصب مسلمان بادشاہ گزرا ہے جس کو ملک والوں کی تہذیب سے نفرت تھی اور وہ اس ملک میں ہندی اداروں کو برباد کرنا چاہتا تھا۔ دوسرا نظریہ ان مسلمان تاریخ لکھنے والوں کا ہے جو اس کو ایک آئیڈیل مسلمان بادشاہ تصور کرتے ہیں جس کا مسلک ہندوستان میں اصلی اسلامی راج قایم کرنا تھا۔ اورنگ زیب بحیثیت ایک مسلمان بادشاہ کے ان کی نظر میں قابل تعریف ہے۔ ان نظریوں کے باعث اورنگ زیب کی شخصیت اور کارنامہ سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں اور ان کا سلجھانا دشوار سا نظر آتا ہے کیونکہ عہدِ وسطیٰ کی تاریخ کے حالات محض ہندو یا مسلم فرقہ واریت کے اصول سے جانچنے کے معنی یہ ہوں گے کہ تاریخ کا صحیح اندازہ نہ لگ سکے گا۔ اورنگ زیب ہندو کا دشمن اور مسلمان کا سرپرست اگر تھا تو اس کے زمانہ کی تاریخ ہمیں ایک دوسری کہانی سناتی ہے۔ یہ بالکل

صحیح ہے کہ اس کے زمانہ میں حکومت کی جانب سے یا بادشاہ کے احکام سے ایسے خلاف ہندو کام ہوئے جس سے انسان فوری اس نتیجہ پر آتا ہے کہ وہ ان کا دشمن تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ اس زمانے کی ہندو پرست شہادتیں بھی ایسی ملتی ہیں جس سے اس بات کا صاف اندازہ لگتا ہے کہ وہ روادار تھا۔ اورنگ زیب کے عہد کو دو بڑے حصوں میں اگر تقسیم کیا جائے تو اس کے متعلق صحیح رائے قایم ہو سکے گی۔ اورنگ زیب کے پہلے بارہ سال کا دور دراصل مغلیہ روایات کا وہ سلسلہ تھا جس میں اورنگ زیب نے مغل راج کے دستور اور طریقوں کو بحال رکھنے کی کوشش کی۔ اسی عہد میں اس نے رواداری کے اصولوں کو حکمرانی میں برتا۔ اورنگ زیب کا دوسرا دور بارہ سال کے بعد شروع ہوا جب کہ اس پر علماء کا اثر ظاہر ہونے لگا۔ اورنگ زیب کے راج کا یہ پہلو آخر وقت تک قایم رہا۔ اس دور میں اورنگ زیب نے اپنے راج کی فضا میں تبدیلی اور گہری تبدیلی پیدا کی۔ اس کی یہ کوشش رہی کہ وہ مغل راج کو اسلامی راج میں تبدیل کرے اور اس بات کا اس نے اعلان بھی کیا کہ وہ قانون اسلام کا پابند ہوتے ہوئے حکومت کرنا چاہتا ہے۔ اورنگ زیب کو اس مسلک کے عملی جامہ پہنانے میں کہاں تک کامیابی ہوئی۔ یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یہیں سے دراصل اورنگ زیب کے خلاف تاریخ لکھنے والوں نے اپنے تاثرات یا رائیں پیش کی ہیں

Marfat.com

جو ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں۔ محض خیالوں کی "تائید یا مخالفت اورنگ زیب کے جانچنے میں ایک حقدار کی مدد نہیں کرتے۔ اورنگ زیب کو اگر جانچنے کی کوشش کی جائے تو اس کو اسی کے معیاروں سے جانچا جاسکتا ہے اور پھر اس کی شخصیت اور اس کے خیالوں کو عمل کی کسوٹی پر کسنے کی کوشش کریں گے۔ اگر اورنگ زیب نے مغل راج کو تبدیل کر کے ایک اسلامی راج ملک میں قایم کیا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ زمانے کی مصلحت کے اعتبار سے ایک صحیح عمل تھا یا راج نیتک اصولوں کے اعتبار سے اپنے میں واجبیت رکھتا تھا یا وہ محض ایک انسان کا خیال تھا جس کو اورنگ زیب پورا کرنا چاہتا تھا یا علماء کے دباؤ کا نتیجہ تھا جس سے اورنگ زیب مرعوب ہو کر اسلامی حکمرانی کی داغ بیل ڈالنا چاہتا تھا۔

مغل تاریخ پر ایک سرسری نظر جواب تک ہم نے ڈالی اس سے یہ ظاہر ہوا کہ مغل راج کی بنیادیں مغل طرز ذہنیت اور جذبوں کی بنا پر مضبوط تر ہوتی جارہی تھیں۔ مغل اثر نے ملک کو اپنا لینے میں انتہائی کامیابی حاصل کی تھی۔ مغل راج اپنے میں سے غیریت کے عنصر کو نکال کر ملک کے سانچے میں ڈھال چکا تھا۔ راج اور رعایا میں یگانگت کے رشتے جڑ گئے تھے۔ مغل راج ایک دیسی راج سمجھا جانے لگا تھا۔ رعایا میں ہندو اور مسلمان کے فرق کو ایسا مٹا دیا گیا تھا کہ حکومت سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتی تھی اور اپنا ہی سمجھتی تھی۔ خصوصاً اکبر کے

Marfat.com

صلح کل اصول نے جو خیال اور عمل کا نظام قایم کیا تھا۔ اس سے ملک میں نئی فضا، نئی طبیعت، نئی امید، نئی مسرت اور نیا میل ملاپ پیدا ہو چکا تھا۔ ایسے حالات میں جب کہ کلچری یکتائی مغل راج کی خصوصیت بن رہی تھی تو اورنگ زیب کا یہ فعل کہ وہ حکومت کی جڑوں کو کھوکھلا کرے اور عوام کی زندگی میں بے چینی، دشمنائی اور خلش پیدا کرے مصلحت کے سراسر خلاف تھا۔

راج نیتک اصولوں کے اعتبار سے اورنگ زیب کی نئی حکومت کی بنیاد جو اس نے اسلامی اصولوں پر رکھی زمانہ کے لحاظ سے اس کی غیر شعوری کوتاہ نظری کو ظاہر کرتی ہے کیونکہ اکبر اعظم کا وہ تخیل کہ ہندوستان کو ایک ہندوستان اعظم میں تبدیل کیا جائے اورنگ زیب کے اس نظریہ سے ٹکراتا ہے اور ملک میں خلاف مرکزی اصولوں اور رجحانوں کو ترقی دیتا ہے۔ ہندوستان کے چھوٹے اور بڑے رجواڑے یہ سب کے سب ہندوستان اعظم کے دائرہ میں اپنے کو محفوظ اور مضبوط سمجھتے تھے۔ اس طرح ملک میں ایک نئی سیاسی فضا رفتہ رفتہ پیدا ہوتی گئی جس نے ہندوستان اعظم کے خیال کے پھیلانے میں مدد پہنچائی۔ اورنگ زیب کے اسلامی راج کا تخیل ہندوستان اعظم کی ترقی میں نہ صرف رکاوٹ ہی بنا بلکہ اس کے انتشار کا باعث بھی ہوا۔ اگر اورنگ زیب واقعی ایک سلجھا ہوا مدبر یا سیاستداں ہوتا تو وہ اپنے راج کو اس طرح زوال پذیر نہ ہونے دیتا۔ اورنگ زیب

Marfat.com

کا اسلامی راج اگر ایک انسان کے جنون کی پیداوار تھی یا علماء کے دباؤ اور اثر کا نتیجہ تھا تو ہم یہ کہیں گے کہ اورنگ زیب کا کوئی ذاتی اصول نہ تھا اور نہ اس کی کوئی اپنی رائے تھی لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ جو شہادتیں اورنگ زیب کے زمانہ کی ملتی ہیں ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اورنگ زیب ایک اصولی آدمی تھا، لیکن وہ اس بات کا اندازہ لگانے میں ناکام رہا کہ زمانہ کے لحاظ سے کہاں تک اس کے اصول اپنے میں جاذبیت، کشش اور کامیاب ہونے کی قوت رکھتے ہیں۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ محض علماء سے متاثر ہوا بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اورنگ زیب کی طبیعت میں شروع ہی سے مذہبی فکر اور سنجیدگی تھی اور اپنی زندگی کو اس نے مذہبی رنگ میں ڈھالا تھا۔ شروع شروع میں مغلیہ روایات اس پر حاوی تھے مگر مغلیہ رنگ کے پھیکے پڑ جانے سے اس کی اصلی شخصیت نمایاں ہوئی۔ جیسے جیسے اس میں مغل ذہنیت کا اثر کم ہوتا گیا ویسے ویسے اورنگ زیب کی شخصیت میں اسلامیت کا رنگ چڑھتا گیا اور اس کی شخصیت علماء کے اثر کو قبول کرنے لگی یعنی اورنگ زیب کے خیال کو علماء کی جماعت سے تقویت پہنچی اور وہ اپنے منصوبوں کو پورا کر سکا۔ فطرتاً اورنگ زیب ایک سادہ، روکھا پھیکا اور خشک انسان تھا۔ اس کی زندگی ہمیشہ سے ایک تپسی جیسی تھی۔ گو مغل زندہ دل اور دنیا دار انسان تھے لیکن اورنگ زیب ایک ایسا انسان

تھا جو اپنی زندگی کو اصولوں کے سانچے میں جکڑ کر اپنے کو تپس کی آگ میں جلاتا تھا۔ اس وجہ سے اس کے اصولوں میں نہ جنبش تھی نہ حرکت اور لچک۔ جس طرح اس نے اپنی زندگی کے ساتھ سختی اور بے مروتی برتی اس طرح اس نے دنیا کے ساتھ اصولوں کو پیش نظر رکھ کر برتاؤ کیا۔ حکمرانی کو وہ ایک سخت اصول اور کڑی تنظیم سمجھتا تھا جو انصاف اور حق کی پابند تھی اور اسلام کا قانون حکمرانی کی رہنمائی کا اصول۔ اورنگ زیب کی شخصی اور حکمرانی زندگی اُن ہی اصولوں اور نظریوں کے تابع تھی۔ اورنگ زیب کا یقین تھا کہ خدا نے اس کو وہ تمام صلاحیتیں بخشی ہیں جو ایک سچے مسلمان حاکم میں ہوتی ہیں اور اس کو حکومت کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ حکومت ایک امانت ہے جو خدا نے اورنگ زیب کو دی تھی جس کی نگرانی، حفاظت اور ترقی کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔ خدا کا حکم اور اورنگ زیب کے نقطۂ نظر سے قانونِ اسلام کا حکم تھا۔ اس قانون کو کامیاب بنانے میں انتھک کوشش کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کی نظر میں دو گروہ میں یعنی مسلمان اور ذمی میں تقسیم کیے گئے۔ اس کے زمانہ کی شہادت یہ بتاتی ہے کہ غیر مسلمانوں پر جزیہ نافذ کیا گیا لیکن تاریخ کی شہادت سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آیا واقعی کل غیر مسلم رعایا سے جزیہ لیا گیا یا نہیں، گو جزیہ کا اعلان ہو چکا تھا۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ اورنگ زیب کی غیر مسلم رعایا ذمی کی حیثیت میں نہ جزیہ دیتی تھی تو اسلامی نقطۂ نظر سے

Marfat.com

اورنگ زیب پر یہ واجب تھا کہ وہ ان کی جان و مال اور ان کے مقدّس مقاموں کی حفاظت اور نگرانی کرے۔ لیکن تاریخ ان واقعات سے بھری پڑی ہے جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں غیر مسلم رعایا کے ساتھ قانون اسلام کی رو سے انصاف نہیں کیا گیا۔ اورنگ زیب کی حکومت کو یہ حق نہ تھا کہ ہندوؤں کے مندروں کو ہاتھ لگائے اور ان کو مسمار کرے۔ اگر مندر مسمار کیے گئے تو اورنگ زیب کی اسلامی حکومت زر جزیہ لینے کے بعد اپنے کو اسلامی قانون کی حمایت نہیں قرار دے سکتی بلکہ اس پہ اسلامی نقطۂ نظر سے معاہدے کے توڑنے کا الزام عائد ہوتا ہے، کیونکہ حکومت قانون اسلام کی پابند تھی۔ مندروں کی مسماری کا سوال ایک اسلامی قانون کی خلاف ورزی کا سوال ہے۔ اورنگ زیب کے حکم سے مندروں کے توڑنے کی تحریک اسلامی قانون کی مخالفت کرتی ہے اور اس کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنی غیر شرعی حرکت کے خلاف جواب دینا ہوگا۔ اگر اورنگ زیب واقعی ایک سچا مسلمان تھا اور قانون اسلام کا پابند تھا تو اس کو ایسی حرکات سے گریز ہی نہ کرنا چاہیئے تھا بلکہ پرہیز بھی۔ لیکن اسی کے زمانہ میں اسی کے حکم سے مندر توڑے گئے تو کیا اورنگ زیب ایک سچے مسلمان بادشاہ یا ایک متعصب انسان ہونے کی حیثیت میں قانون اسلام کی رو سے جانچا جا سکتا ہے۔ یا ان مندروں کے توڑ پھوڑ کے سلسلہ میں اور

Marfat.com

کوئی سیاسی جذبات کام کر رہے تھے جس کی وجہ سے ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ اس سلسلہ میں تاریخ ہمیں بہت ہی کم مواد پیش کرتی ہے۔ ان مندروں کے سلسلہ میں تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ ملک میں بعض نئے مندر بھی سرکاری دولت کی لوٹ مار سے بنائے گئے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اورنگ زیب نے صرف ان ہی نئے مندروں کو توڑا اور پرانے مندروں کو بحال رکھا ایک ایسا پیچیدہ گورکھ دھندا ہے جس کا سلجھانا بے حد مشکل ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اورنگ زیب اسلامی اصولوں پر ضرور چلا تھا لیکن جس تعصب اور فرقہ واریت کا اظہار تاریخ لکھنے والوں نے اس کی شخصیت سے متعلق کیا ہے اس میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ اورنگ زیب نے جس طرح مندر مسمار کروائے اسی طرح اس نے مندروں کو اوقاف بھی عطا کیے ہیں۔ ظاہر اطور پر اس کا یہ عمل مختلف اصولوں کا تضاد معلوم ہوتا ہے لیکن اس عمل سے اورنگ زیب کے متعصب اور غیر متعصب ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔ تحقیق کرنے والوں کا یہ فرض ہوگا کہ اورنگ زیب کے ان پہلوؤں پر نظر ڈالیں اور کھوج لگائیں کہ اس کے کارناموں میں مذہب کا عنصر کہاں تک کام کرتا تھا اور سیاسیات کا کہاں تک ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اورنگ زیب مذہبی انسان ضرور تھا لیکن اس کی ہستی میں ایک چھپا ہوا سیاست داں بھی بیٹھا ہوا تھا جو اکثر و بیشتر اپنے کو نمایاں کرتا رہا، لیکن وہ منظر عام پر نہیں لایا گیا۔ اس کی قوت

Marfat.com

اور اس کی کارکردگی سے زمانہ اور لوگ متاثر ہوئے۔ عام خیال یہ ہے کہ اورنگ زیب کے مذہبی انسان ہی نے تمام کاموں میں محرک کا کام دیا تھا۔ اس طرح اورنگ زیب کی شخصیت کی گتھی سلجھائی جاتی ہے اور اس کے بعد تاریخ اپنا تصفیہ کہ اورنگ زیب کیا شرع شریعت کا پابند اسلامی حکمران تھا یا ایک مذہب کا بہروپیا تھا جو ایک سچے ہوئے سیاست داں کے روپ میں ظاہر ہوا۔

اورنگ زیب میں تمام مغل حکمرانوں کے مقابلہ میں وہ احساس کہ حکمرانی ایک بڑی ذمہ داری ہے نمایاں طور سے پایا گیا۔ اس کے زمانہ میں جس طرح حکومت کے حدود وسیع تر ہو چکے تھے اسی طرح اس نے حکمرانی کی ذمہ داری کو زیادہ محسوس کیا اور اس بات کی کوشش کی کہ راج پاٹ کے کاروبار انصاف کے اصولوں پہ ہوں۔

اورنگ زیب کا سیاسی خیال مرکز کے اصول کے تحت کام کر رہا تھا یعنی ایک قوی مرکز کو بنانا اور اس کے ذریعہ ملک میں امن قائم رکھنا اس کا شیوہ تھا۔ لیکن حالات اس تیزی سے بڑھتے جا رہے تھے اور اپنے میں الجھنیں اور پیچیدگیاں پیدا کر رہے تھے کہ ایک طاقتور حاکم کے لیے دشوار تھا کہ وہ پرانی انتظامی حکمرانی کے مشین کے ذریعہ راج پاٹ میں درستی کر سکے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ مغل حکومت ایک مضبوط مرکز پہ پہنچ چکی تھی لیکن اس میں اندرونی امن پیدا ہوتا ہوا کم دکھائی دیتا ہے۔ حکومت کی اندرونی حالت مقابلتاً بیرونی حالت کے زیادہ

Marfat.com

بوسیدہ اور کمزور تھی جس کے دور کرنے میں اورنگ زیب کامیاب نہیں ہوا۔ اورنگ زیب کی ناکامی کا سبب محض مرکزی اصول کی کمزوری ہی نہیں تھی بلکہ اس کی شخصیت بھی ذمہ دار تھی۔ اورنگ زیب کے دور میں سیاسی یکجائی کو خطرہ پہنچ رہا تھا۔ غیر مسلم رعایا کی بے چینی اور ناراضگی بھی مرکزی حکومت کو کمزور کر رہی تھی۔ اورنگ زیب نے اس بات کی کوشش نہیں کی کہ وہ ان اندرونی اسباب کو دور کرے جو آگے چل کر مغل سلطنت کے زوال کا باعث بنتے ہیں۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اورنگ زیب حکمرانی کے اصولوں کو کامیاب بنانے میں بے حد منہمک رہا اور اس کام کی انجام دہی میں اس کی صلاحیتیں بھی اس کی مدد کو آئیں۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ اورنگ زیب ایک خاص ذہنیت کا انسان تھا اور جس کے اصول زمانہ کا ساتھ نہ دے سکے۔ وہ اس بات سے غافل تھا کہ زمانہ آگے بڑھ چکا ہے اور وہ جن اصولوں پر چل رہا تھا وہ اس کو پیچھے پھینک رہے تھے، لیکن اس کا یقین اپنے اصولوں کی سچائی اور درستی کے متعلق ایسا تھا کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب ہوگا۔ اورنگ زیب نے اسلامی نقطۂ نظر سے حکومت کرنے کی کوشش کی لیکن اس اسلامی اصول میں اس کی سیاست کاری بھی پوشیدہ تھی۔ اس کے کاموں میں جہاں اسلامی جھلک نظر آتی تھی وہاں راج نیتک اصول

Marfat.com

بھی کارفرما تھے۔ اورنگ زیب کے زمانہ کی تاریخی شہادتوں اور اس کے خطوں سے یہ امر صاف ہو جاتا ہے کہ حکومت کو کامیاب بنانا ایک بہت ہی کٹھن کام ہے۔ اس کے لئے کڑی نگرانی، کھلا انصاف، غیر جانب داری اور تیز فہمی کی ضرورت ہے۔ اورنگ زیب کے خط دراصل اس کی شخصیت کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ ان کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کو کن دشواریوں اور کٹھنائیوں سے گزرنا پڑا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے حکومت کے امور سے متعلق کیا کیا خیال ظاہر کیے اور کیا کیا تدبیریں اختیار کیں۔ ان خطوط کی بنا پر ہم اورنگ زیب کی ذہنیت کا پتا کہ اس کے خیالوں اور جذباتوں کی روشنی میں پیش کریں گے۔

اورنگ زیب ملک گیری کو شاہی کا مسلک قرار دیتا ہے اور اس یقین کو واضح کرتا ہے کہ جہانگیری کے سلسلہ میں جہانبانی بھی ایک مقدم اصول ہے شاہی کا۔ جہانگیری محض ایک خواب یا خیال کے مانند ہے اگر جہانبانی اس کی بنیاد کا کام نہ دے۔ ملک کا فتح کرنا، فوجوں کی تنظیم اور سنگھٹن کا سوال ہے۔ لہذا حکومت کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ فوجوں کو ایسی حالت میں رکھے کہ وہ اپنی جنگجویانہ صفتوں کو موقع و محل کے لحاظ سے دکھا سکے اور حکومت کے آڑے وقت اپنے کو وفاداری اور نمک حلالی کے

جذبہ کے تحت قربان بھی کر سکے۔ فوجی قوت حکومت کی جان ہے۔ اس وجہ سے اورنگ زیب نے فوجی طبقہ کا خاص لحاظ رکھا اور ان کی خدمات کے مطابق ان کو اعزاز اور مرتبے بخشے۔ اورنگ زیب بھی خوب جانتا تھا کہ محض فوجی قوت کی بنا پر حکومت نہیں ہو سکتی۔ جہانبانی ایک دوسری چیز ہے جس کا دارومدار فوج اور اس کے لوازمات پر نہیں۔ جہانبانی حکومت کی تنظیم سے فروغ پاتی ہے اور حکومت کی تنظیم سیول افسروں کے صحیح انتخاب پر منحصر ہے۔ اورنگ زیب کے بیشتر خط سیول انتظامات سے متعلق ہیں۔ ان سے اس بات کا اندازہ لگتا ہے کہ حکومت کے سیول انتظامات میں اورنگ زیب کو بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ یہ ایسے امور ہیں جہاں قاعدے اور ضابطے کا عمل ہوتا ہے۔ ان کی پابندی یا ناپابندی سے حکومت کے معاملوں میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اورنگ زیب کے سامنے جو سب سے بڑا مسئلہ تھا وہ یہ کہ افسروں کی نگرانی اس طرح کی جائے کہ ان میں کارکردگی کا احساس پیدا ہو، ایمانداری سے کام انجام دیں، دادرسی کے اصول کو بلند کریں، ناانصافی کی جگہ انصاف دیں، ظلم اور زیادتی کو دور کریں، جانبداری سے پرہیز کریں، سازشی اور مفسد کو سزا دے کر منزل پر پہنچائیں، رعایا پروری ان کا اصول ہو اور ملک اور مالک سے وفادار رہیں۔

Marfat.com

یہ ایسے حکمرانی مسئلے تھے جن کی گتھیوں میں اورنگ زیب پھنس کر کبھی نکلا اور کبھی نہیں۔ اس کے خطوں میں ایک آواز جو اُلٹ پھیر کر سنائی دی وہ یہ کہ ظلم کسی شکل میں ہو روا نہیں رکھا جا سکتا۔ ظلم کی مار ایک دھائی ہے جو حکومت کو ختم کر دے گی اور عاقبت میں بھی اس سے نجات نہیں مل سکتی۔ لہذا اورنگ زیب نے جب کبھی بھی ظلم ہوتے ہوئے دیکھا یا سُنا یا اس کے کانوں تک اُس کی آواز پہنچی تو اس نے بلا لحاظ مذہب و ملت انصاف کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اس کی نظر میں ظلم دور نہیں ہو سکتا جب تک انصاف نہ کیا جائے۔ انصاف سب کے ساتھ ہے۔ اس بات کا لحاظ کئے بغیر کہ انصاف کس کو مل رہا ہے اور انصاف کی وجہ سے کون مارا جا رہا ہے۔ انصاف کی تلوار شاہی سے لے کر ادنیٰ انسان تک اپنا مساویانہ اور یکساں وار کرتی ہے تاکہ اسے اپنا حق ملے۔

اورنگ زیب نے ہمیشہ اس بات پر اصرار کیا کہ حکمرانی امور کی چھان بین بہت ضروری ہے۔ محض جذبات کے بھڑکنے پر یا شخصی تعصب کی بنا پر یا جانب داری کے جذبہ پر یا مکر و فریب یا سازش پر حکومت کو کبھی قدم نہیں اٹھانا چاہیئے۔ حکومت اگر ایسا کرے تو اس سے بُرے نتائج پیدا ہوں گے۔ اس کی عزت اور اس کا وقار لوگوں کی نظر میں گر جائے گا اور ملک میں بے چینی اور بدامنی پھیلے گی۔ اورنگ زیب نے اپنے خطوں

جب کبھی ایسے حالات سے واقفیت حاصل کی تو اس بات کی سخت تاکید اور تنبیہ کی کہ سرکاری کارروائی اٹھنے سے پہلے پوری تحقیق ہو جانی چاہیئے ورنہ حکومت انصاف نہ کر سکے گی اور اس کے بدنام ہونے کا ڈر رہے گا ہمیں ایسی شہادتیں بھی اس کی جانب سے ملتی ہیں جس کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اورنگ زیب نے اپنے مسلم اور غیر مسلم نمک حلال افسروں کے ساتھ انصاف ہی نہیں برتا بلکہ ان کو اعزاز اور مرتبے بھی دیئے۔ ایسی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان افسروں نے غیر مسلم افسروں کے خلاف اورنگ زیب کے کان بھرے اور اس بات کی کوشش کی کہ ان کو برطرف کرنے کے احکام لیں، لیکن وہ اپنے مالک کو رام نہ کر سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اورنگ زیب اپنے افسروں کی وفاداری کے جذبات کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ ایسے موقعوں پہ اس کو اس بات کا خیال کبھی نہیں آیا کہ آیا اس کا افسر مسلم ہے یا غیر مسلم۔ وہ افسر کی تعریف میں صرف ایک گن چاہتا تھا یعنی وفاداری اور نمک حلالی یہی اس کی کسوٹی تھی اور اس کسوٹی پر اس نے اپنے زمانہ کے انسانوں کو کسا، چاہے وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس کے ہاتھوں افسروں نے مار کھائی، جس میں مسلم اور غیر مسلم برابر

Marfat.com

کے شریک تھے۔ اس کو ہمیشہ اس بات کا افسوس اور رنج رہا کہ اس کے افسروں میں بے وفائی، بدنیتی اور دھوکہ بازی تھی؛ گو اس نے ان کی قدرشناسی، ان کی ہمت افزائی اور سرپرستی اس وجہ سے کی تھی کہ وہ ملک و مالک کے وفادار رہیں اورنگ زیب کے آخری زمانہ میں ایک ایماندار افسر کا ملنا تعجب کی بات تھی۔ اورنگ زیب نے اپنے ایک خط میں اس بات کا اعتراف کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے مسلم اور غیر مسلم سرکاری افسر اس بات کے کوشاں نہ تھے کہ وہ اورنگ زیب کے اسلامی مسلک کو پروان چڑھانے میں مدد دیں بلکہ اس بات کے دلچسپ تھے کہ سازشوں، مکاریوں اور بٹے بازیوں کے ذریعہ وہ اپنا بھلا کہاں تک کرتے ہیں۔ اورنگ زیب نے اپنے ایک خط میں جب کہ وہ زندگی کے آخری لمحے گن رہا تھا اس بات کا ذکر انتہائی افسوس سے کیا ہے کہ اس کی کُل زندگی ناکام رہی۔ اس کے منصوبے اور ارادے اس کے ہاتھوں ختم ہو گئے، اس کے افسروں کی بے وفائیاں اس کی مایوسی کا باعث رہیں۔ اس کے مسلک نے ناکامی کا منہ دیکھا۔ وہ لکھتا ہے کہ:

"اس کا جسم ہڈی اور پوست ہو چکا ہے۔ اس کے

کندھوں پہ دنیا کے گناہوں کا بوجھ ہے۔ چاروں طرف اُداسی اور مایوسی چھائی ہوئی ہے۔ دوزخ کی آگ کے خیال سے اس کو ڈر پیدا ہوتا ہے۔ وہ اللہ سے درخواست کرتا ہے کہ اس کے گناہ معاف کئے جائیں۔"

Marfat.com